ali's
STREET 12
hauntings of past
One House, One Night, No Escape:
A Terrifying Countdown to Survival.

Street 12

Ali

Street 12,
by Muhammad Ali
Urdu Novel,
Aiena Publications, karachi,
2023
113 P.

اشاعت اوّل:2023

© آئینہ پبلی کیشنز، کراچی

اس کتاب کے کسی بھی حصے کو کسی بھی صورت منتخب یا مکرر اشاعت یا بصورت فوٹو کاپی، ریکارڈنگ، الیکٹرانک، مکینیکل، ویب سائٹ اور سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر اپ لوڈ کرنا، ناشر کی اجازت کے بغیر منع ہے۔
کسی بھی قسم کی خلاف ورزی کی صورت میں قانونی کارروائی کی جائے گی۔

Price: 800/-

@AUTHOR.ALI7

Contact: Cell+:966502051083
Email: rohail_ali7@hotmail.com

Dedicating this book to pioneer writers of Pakistan

Ishtiaq Ahmed & Maqbool Jahangir

Their captivating words ignited my imagination and accompanied me through the journey of my childhood. Their stories have been a source of inspiration and joy, shaping my love for literature. This book stands as a testament to the impact of your storytelling prowess.

Thank you so much for everything.

Ali

کچھ باتیں

خوفناک کہانیاں جتنی مجھے پڑھنا اور ٹی وی پر دیکھنا پسند ہے اُتنا ہی مجھے انہیں لکھنا بھی پسند ہے۔مگر خوفناک کہانیاں لکھتے ہوئے جو سب سے مشکل ترین مرحلہ پیش آتا ہے وہ یہ کہ انہیں لکھتے ہوئے مصنف کا خود دہشت زدہ رہ جانا ازحد ضروری ہے۔ اگر مصنف اپنی لکھے ہوئے سے خود خوف زدہ نہیں ہوسکتا تو اُس کے پڑھنے والے بھی کہانی کی دہشت کو محسوس نہیں کرسکیں گے۔ جب تک کوئی پہلو یا موضوع میرے رونگٹے نہ کھڑے کردے تب تک مجھے یہ اطمینان نہیں ہوگا کہ میرے پڑھنے والے بھی خوف محسوس کررہے ہیں یا نہیں۔ اسی وجہ سے خوفناک کہانیاں لکھتے ہوئے میں جس عذاب اور کرب سے گزرتا تھا۔ وہ میں ہی جانتا تھا۔ اکثر یہ ناول میں نے رات کے اندھیرے میں لکھے تھے جہاں میں، تنہائی اور خیالات ساتھ موجود ہوتے۔ جب میں ایک باب پُورا کرتا تو یقین جانیے، پسینہ ماتھے پر چمک اُٹھتا، دل دھڑکنے لگتا اور پھر نیند کی آغوش میں جانا دُشوار ہوجاتا۔

میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ جس طرح پاکستان میں لکھے گئے رومانوی ناولوں میں جب تک ساس بہو کا ذکر نہ ہو اُسی طرح خوفناک کہانیوں میں جب تک چڑیل یا کالا جادُو نہ ہو، ناول مکمل نہیں ہوسکتا۔مگر میرے ناول منفرد ہیں اور یہ بات آپ محسوس کریں گے جب

آپ 12 Street پڑھنا شروع کریں گے۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہ اُن ناولوں سے بہت الگ ہے جو آپ ماضی میں پڑھ چکے ہیں۔

آپ کو جان کر شاید حیرت ہوگی کہ یہ کہانی میرے خواب پر مبنی ہے۔ 2008 کی سرد رات میں نیند کی آغوش میں تھا۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک گھر کے لاؤنج میں موجود ہوں جہاں میرے علاوہ کوئی اور موجود نہیں۔ ایک عجیب دہشت زدہ سا لاؤنج، بڑی بڑی سفید دیواریں، ٹمٹماتی ہوئی ٹیوب لائٹ اور گہرا سناٹا۔ میری نظروں کے سامنے لکڑی کا بنا ہوا ایک مظبوط دروازہ ہے جو نجانے کب سے بند پڑا ہے۔ نجانے کیوں میں اُس دروازے کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو رہا ہوں۔ مجھے اُس دروازے کو دیکھ کر خوف محسوس ہو رہا ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ دروازہ کسی بڑی طاقت کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے، کوئی بلا اس لکڑی کے دروازے کے پیچھے میری موت کے منتظر ہے۔

میں خوف کے عالم میں اس دروازے کو تک ہی رہا تھا کہ اچانک وہ دروازہ بُری طرح ہلنے لگتا ہے، جیسے کوئی مخلوق ہر حال میں میرے پاس آنا چاہتی ہے۔ میں خوف کے عالم میں اُس دروازے کو تک رہا ہوں، پاؤں جیسے جم سے گئے، خون نے رگوں میں گردش کرنا چھوڑ دی۔ میں دم بخود بس اُس دروازے کو تکے جا رہا ہوں۔ دوسرا ہی لمحے دروازہ کھلتا ہے اور باہر آنے والے چیز پر جب میری نظر پڑتی ہے تو میرے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ جو چیز باہر آئی اُسے دیکھنے کے لیے میں بالکل بھی تیّار نہ تھا۔ وہ چیز کیا تھی؟ یہ میں آپ کو یہاں نہیں بتا سکتا۔ اس کے لیے آپ کو پُورا ناول پڑھنا پڑھے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ جب اس ناول کے اختتام پر پہنچیں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ میرا خواب کس قدر عجیب تھا۔

جب میں نے یہ خواب دیکھا تو طبیعت بے حد عجیب ہونے لگی۔ سمجھ نہیں آیا کیونکر ایسا خواب دیکھا ہے، لیکن مسلسل اس خواب کے بارے میں سوچتے رہنے پر میں نے فیصلہ کیا کہ اسے ایک کہانی کی شکل دے ڈالوں۔ خیال دہشت ناک تھا، لیکن خیال زبردست تھا۔ اس لیے یہ ناول لکھ ڈالا جس کا نام ہے 12 Street۔

ایک بات میں یہاں عرض کرتا چلوں کہ خواب کی کوئی تُک نہیں ہوتی۔ ان کی شروعات ہوتی ہے نہ ہی اختتام۔ یہ تو کچھ تصویریں ہیں جو آپ کے ذہن میں چل پڑتی ہیں اور آپ انہیں دیکھنے

لگتے ہیں۔مگر جب ناول لکھنا ہوتو پھر ہر چیز کو سوچ سمجھ کر لکھا جاتا ہے۔کہانی کے کردار کون ہیں؟ شروعات کیا ہوسکتی ہے اور اختتام کیا ہوسکتا ہے۔کسی بھی ناول کو لکھنے کے لیے محض ایک خواب یا خیال ہی کافی نہیں ہوتا،اس کے لیے آپ کو پورا ایک Structure چاہیے ہوتا ہے۔اس لیے اس کہانی کو ناول میں ڈھالنے کے لیے سوچنے بیٹھا تو کڑیاں جُڑتی چلی گئیں اور میری زندگی کا ایک انوکھا شاہکار میں نے مکمل کر ڈالا۔

یہ کہانی اُس بدنصیب رات کی کہانی ہے جہاں ایک شخص کے ساتھ عجیب وغریب حالات رونماں ہوتے ہیں۔خوف اور دہشت نے اُسے جکڑ کر رکھ دیا۔جسم کا خون خشک ہوگیا اور عقل سمجھنے سے قاصر ہوگئی جب وہ اپنے ہی گھر میں کسی اور دُنیا میں شامل ہوگیا جہاں انسانیت نام کی کوی شے نہیں۔وہ شخص اپنے ہی گھر میں قید اور تنہا اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے،لیکن موت اتنی آسان نہیں جتنا اُس نے سوچا تھا۔اُس کے ساتھ ہونے والے حالات جب آپ پڑھیں گے تو یقیناً ناول آپ کو حیران کرتا چلا جائے گا۔

جیسا کہ میں پہلے اپنی کتابوں میں عرض کر چکا ہوں کہ میں اشتیاق احمد صاحب کا بڑا فین ہوں۔مگر اُس کے ساتھ ساتھ میں نے مقبول جہانگیر صاحب کی کہانیاں بھی پڑھی ہیں۔مقبول صاحب کی لکھی ہوئی خوفناک کہانیاں واقعی ریڑھ کی ہڈّی کو آج بھی سُن کر کے رکھ دیتی ہیں۔میں اپنی یہ کتاب ان دو شخصیات کے نام کرتا ہوں جن کی وجہ سے مجھ میں لکھنے کا شوق بیدار ہوا۔

12 Street میری لکھی ہوئی کہانیوں میں سب سے چھوٹی کہانی ہے اور کئی بار Re-Draft کرنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ کہانی شائع ہونے کے لیے تیّار ہے۔12 Street آپ کے سامنے حاضر ہے، پڑھیے اور اپنے رائے کا اظہار کیجیے۔

آپ کا

علی

Chapter 1

کراچی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر دبئی سے آنے والا جہاز بخیریت رَن وے پر اتر گیا۔ میں اپنی جہاز کی سیٹ پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا، جسم بے جان محسوس ہونے لگا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی یہ فلائٹ کسی صدی سے کم نہیں تھی۔ شاید میری تھکن کی وجہ وہ راتیں تھیں جو میں نے جاگ کر گزاری ہیں۔ پچھلے دو دن سے میں مسلسل جاگ رہا تھا۔ تھکن سے جسم جیسے ٹوٹنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے مگر آرام بھی انھیں نصیب ہوتا ہے جن کا ذہن اور دل سکون میں ہو اور میرے نصیب میں سکون نہیں لکھا تھا۔

میرا نام روحیل احمد ہے۔ میری عمر پینتیس سال ہے۔ میں کراچی شہر کا رہنے والا ہوں مگر کچھ برس سے دبئی کے ایک بینک میں ملازم ہوں، چونکہ دبئی اس قدر مہنگا ہے کہ نو گھنٹے کی نوکری کے بعد مجھے دو وقت کی روٹی ہی مل پاتی تھی اور شاید یہ دو وقت کی روٹی میرے لیے کافی تھی۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ نوالے ہی تو درکار تھے، اس سے زیادہ کی چاہ مجھے نہیں تھی۔ میرے پاس تھا ہی کیا؟ ایک بیوی تھی، ایک بیٹا تھا، مگر پھر سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا.... سب کچھ۔

جہاز کراچی انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے رَن وے پر دوڑ کر رک گیا اور کچھ ہی دیر میں جہاز ٹرمینل پر لگنے والا تھا۔ جلد ہی جہاز کے دروازے کھلے اور سب مسافر اپنا اپنا ضروری سامان لے کر اترنے لگے، میں بھی ان ہی میں شامل تھا۔ کالی جینز اور نیلی شرٹ پہنے ہوئے میں نے اپنا ہینڈ بیگ کندھے پر ڈالا۔ اب میں بھی باقی مسافروں کی طرح قطار میں لگا ہوا جہاز سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی میں نے اپنے قدم ایئرپورٹ پر رکھے اور چلتا ہوا

امیگریشن کی طرف بڑھا۔ امیگریشن پر پاسپورٹ پر ٹھپّہ لگوا کر میں سامان حاصل کرنے کے لیے بڑھا۔ جلد ہی میرا دوسرا بیگ میرے ہاتھ میں تھا اور میں گرین چینل سے گزر کر باہر آیا۔ باہر نکلتے ہی سیکڑوں اجنبی چہرے میرے سامنے موجود تھے لیکن اس بھیڑ میں مجھے تلاش اپنوں کی تھی، اس لیے نظر دوڑانا شروع کی۔

''روحیل؟''

میری بہن حنا نے مجھے آواز دی۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ میری ہی ہم صورت، ہمشیرہ حنا مسکراتی ہوئی مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ میں بھی اداس مسکراہٹ لبوں پر چسپاں کر کے اس کی طرف چل پڑا۔

''کتنے دبلے ہو گئے ہو تم؟'' حنا نے مجھے دیکھ کر یہ جملے کہے اور میں اس کے گلے لگا۔

''کیسی ہو؟'' میں نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''بالکل ٹھیک۔ چلیں؟'' حنا نے خوشی سے کہا۔

''چلو۔''

میں نے مختصر جواب دیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ راستے بھر میں خاموش رہا۔ اداس نگاہوں کے ساتھ گاڑی کی کھڑکی سے باہر نظارہ کرتا رہا۔ کراچی خاصا بدل چکا تھا۔ اب یہاں کی سڑکیں اس قدر خراب نہیں تھیں جتنی پہلے کبھی ہوا کرتی تھیں۔ حنا بھی خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہی تھی، ایک نظر مجھے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ جو اندھیرا میں اس شہر سے لے کر گیا تھا وہی اندھیرا اپنے اندر رابسائے پلٹ آیا ہوں۔ کچھ سوچ کر وہ کہنے لگی:

''شکر ہے کہ تم کراچی واپس تو آئے۔ ورنہ تم نے تو اس شہر سے جیسے منہ ہی موڑ لیا تھا۔''

حنا کی بات سن کر میں نے پلٹ کے اس کا چہرہ دیکھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ میرے لبوں پر نمودار ہوئی:

''تم لوگوں کی ضد پر مجھے آنا ہی پڑا۔''

''وہ اس لیے کیوں کہ تم یہ بھول بیٹھے ہو کہ تمھاری ایک بہن اور بہنوئی اس دنیا میں موجود ہے۔ ہم تمھارے کوئی غیر نہیں بلکہ اپنے ہیں۔''

حنا نے پیار بھرے لہجے میں یہ جملے کہے اور میں اداس مسکراہٹ چہرے پر لے آیا۔

’’پرانی یادوں سے جتنی جلدی ہو سکے روحیل اتنی جلدی نکل آو۔ جو بیت گیا سو بیت گیا، وہ اب پلٹ کر واپس نہیں آ سکتا۔‘‘ حنا نے مجھے دیکھ کر سمجھایا۔

’’جانتا ہوں حنا.... کبھی کبھار سب کچھ بھولنے کی کوشش بھی کرتا ہوں.... مگر کچھ یادیں ہیں جو بار بار ستاتی ہیں.... صبا کی یادیں.... میرے بیٹے اکمل کی یادیں.... مجھے بہت ستاتی ہیں۔‘‘

یہ کہ کر میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا اور حنا میری طرف دکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔

’’نجانے کون تھا وہ جس نے میری بیوی اور معصوم بچّے کا قتل کر دیا.... نجانے کیا چاہتا تھا وہ۔‘‘ میں جیسے اپنے آپ سے گفتگو کرنے لگا۔

’’روحیل.... یہ تین سال پرانی بات ہے.... تین سال....ایک بڑا عرصہ ہوتا ہے.... بہت کچھ بدل جاتا ہے.... ہم خداب پہلے جیسے نہیں رہے.... گزرتے ہر لمحے کے ساتھ.... ہماری عمریں بھی بڑھ رہی ہیں.... عادتیں بھی بدل رہی ہیں.... رہی بات اس قاتل کی.... نجانے وہ قاتل.... کہاں سے کہاں چلا گیا ہوگا.... تمھیں صبر کرنا پڑے گا....اس کے علاوہ اور کوی حل ہمارے پاس نہیں ہے....اگر کچھ ہوتا.... تو ضرور اس پر عمل کیا جا سکتا تھا.... لیکن اب کافی وقت گزر چکا ہے....‘‘

حنا مجھے دیکھتے ہوے کہتی چلی گئ اور میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی کا مطلب حنا سمجھ چکی تھی کہ میں اس ٹاپک پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری خاموشی کو سمجھ کر اس نے بھی خاموشی کو بہتر سمجھا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

حنا گاڑی چلاتی ہوی ایک موڑ مڑی اور میں چونک گیا۔ یہ رستہ میرے گھر کا نہیں تھا۔ کچھ کہنے بنا حنا مجھے اپنے گھر لے چلی۔ گھر کے دروازے کے باہر گاڑی پارک کی تو میری طرف دیکھنے لگی۔ میں الجھن کے عالم میں اس کے گھر کو تکنے لگا۔ گردن گھما کر حنا کی طرف دیکھا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی:

’’چلو....‘‘

’’حنا.... یہ میرا گھر تو نہیں؟ مجھے تو....اپنے گھر جانا ہے۔‘‘

میں نے ٹھیرے ہوے لہجے میں یہ جملے کہے۔

’’تم چلو تو سہی....‘‘

حنا نے ضد کی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتری۔

اس بار میں بنا کچھ کہے گاڑی سے اترا۔

بیگ ابھی بھی میرے ہاتھوں میں تھا۔گاڑی کا دروازہ بند کیا اور دھیمے قدموں سے میں حنا کے ساتھ چل پڑا۔جلد ہی ہم گھر کے دروازے کے سامنے موجود تھے۔حنا نے چابی لگا کر دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ہم چلتے ہوئے گھر کے لاؤنج میں پہنچے تو مجھے میرے بہنوئی فراز کا چہرا نظر آیا۔لمبا،خوبصورت،خوش شکل،زندگی سے بھرپور فراز۔جو میری بہن سے بے انتہا عشق کرتا تھا۔

"Hi Rohail"

وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے بولا اور پاس آ کر مجھے گلے لگایا۔

میں بھی اس کے سینے سے لگا۔

’’تو تو بڑا اسمارٹ ہو گیا ہے،دبئی میں کیا ورزش چل رہی تھی؟‘‘

فراز نے مسکرا کر مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’ہاں،تھوڑی بہت۔‘‘میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

’’آؤ آؤ اندر آؤ۔‘‘فراز نے پیار سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ جملے کہے اور ہم تینوں اندر کی طرف بڑھے۔

’’لاؤ بیگ مجھے دے دو۔‘‘

فراز نے میرے کندھے سے بیگ لیا اور اندر کی طرف لے گیا۔

’’تم یہاں بیٹھو آرام سے....‘‘

حنا نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے ڈرائنگ روم کی طرف لے جا کر کہا۔میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔

’’بیٹھو۔‘‘

حنا نے پیار سے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور میں صوفے پر بیٹھا۔

سرد آہ لے کر اپنی بہن کا چہرہ دیکھا:

''تو مجھے تمھارے گھر پر رہنا پڑے گا؟''

''ہاں۔ ہمارے ساتھ، کچھ وقت ہمارے ساتھ بھی بِتاؤ، تو کیا چلا جائے گا تمھارا؟'' حنا نے مسکرا کر پوچھا۔

"I can't"

میں نے نفی میں سر ہلا کر یہ جملے کہے اور حنا کو دیکھ کر مخاطب ہوا:

''مجھے واپس اپنے گھر جانا ہے، مجھے اپنی چار دیواری میں رہنا ہے۔''

''روحیل، تمھیں اب وہاں کچھ نہیں ملے گا، بس بری یادیں اور کچھ نہیں۔ تو پھر اپنے گھر جا کر کیا کرنا۔ یہاں تم میرے پاس رہو، میں تمھاری خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گی، تمھارا کمرا تک میں نے تیار کر کے رکھ دیا ہے۔ تمھیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی، یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔'' حنا کہتی چلی گئی۔

''نہیں حنا۔ میں یہاں نہیں رک سکتا۔ میرا واپس میرے گھر جانا بہت ضروری ہے۔ صبا اور اکمل مجھے بلا رہے ہیں۔''

میں نے نظریں نیچے کر کے یہ جملے کہے۔ آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حنا رنجیدہ ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔

''صبا نے اس گھر کی بنیاد.... بہت محبت سے رکھی تھی.... بہت پیار سے.... ہم نے وہ آشیانہ بنایا تھا.... اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا.... کہ ہم کبھی....اپنے گھر کو سونا نہیں ہونے دیں گے.... تو پھر میں....اپنے وعدے سے کیسے مکر جاؤں....مجھے اپنا وعدہ نبھانا ہے حنا.... مجھے اپنا وعدہ نبھانا ہے....''

میں کہتا گیا اور حنا میری باتوں کو سن کر خاموش ہو گئی۔

''سوچ رہا ہوں....اپنے گھر جا کر.... کچھ یادیں سمیٹ کر....ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دبئی چلا جاؤں....اس کے بعد چاہے تم لوگ میرا گھر بیچ ڈالو.... مجھے پروا نہیں....اس طرح جو کچھ پیسے ملیں گے....وہ تمھارے لیے کام آئیں گے.... پر فی الحال میرا واپس اپنے گھر جانا ہر طرح سے ضروری ہے....'' میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ میرا فیصلہ سن کر حنا خاموش رہی۔

ایسے میں فراز ہاتھوں میں جوس لیے ہوئے کمرے میں آیا:

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

''دیکھیے نا، روحیل واپس گھر جانے کی ضد کر رہا ہے۔''

حنا نے اپنے شوہر کو دیکھ کر میرا فیصلہ بتایا اور فراز نے میری طرف دیکھا۔ میں پہلے سے ہی نظریں نیچی کیے ہوئے بیٹھا تھا۔

فراز نے ایک سرد آہ لی اور جوس میرے سامنے ٹیبل پر رکھ کر بیٹھ گیا۔

''روحیل.... دیکھو.... ہمیں کوئی حق نہیں کہ تمھیں تمھارے گھر جانے سے روکیں.... وہ تمھارا گھر ہے، تم جب چاہو جا سکتے ہو.... مگر جہاں تک رہنے کی بات ہے.... تم ہمارے گھر پر ہی ٹھہرو تو زیادہ بہتر ہے....'' فراز نے پیار سے مجھے سمجھایا۔

''نہیں فراز.... یہ میرے لیے ممکن نہیں....'' میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''بات کو سمجھنے کی کوشش کرو.... تمھارا گھر اب.... صرف ایک خالی مکان نہیں رہا ہے.... اس گھر میں.... اس گھر کی دیواروں میں.... کھڑکیوں میں.... ایک ایسا واقع چھپ چکا ہے.... جسے انسان تو کیا.... بے جان اینٹیں بھی بھلا نہیں سکتیں.... غم ہو یا خوشی.... گھر اپنی بانہوں میں یادوں کی چبھن کو سما لیتا ہے.... اپنے اندر بسا لیتا ہے.... اور ہم سب جانتے ہیں کہ وہاں.... دو انسانوں کا بے رحمی سے قتل کیا گیا ہے.... تم اب اس گھر کی کیفیت نہیں سمجھ سکتے....''

فراز کہتا چلا گیا۔

''فراز....''

میں نے اسے دیکھا اور اس کے لب ہلے:

''وہ دو انسان کوئی اور نہیں.... میرے اپنے تھے.... وہ میری بیوی تھی.... میرا بچّہ تھا.... تو کیا ہوا اگر میرے آنگن میں اداسیوں کے سوا کچھ نہیں.... تو کیا ہوا اگر میں اپنے دامن میں صرف آنسو ہی سنبھال سکا ہوں.... یہ درد ہے تو میرا اپنا ہی....''

میں جیسے اپنے آپ سے کہتا چلا گیا۔

''سب کچھ بدل گیا ہے.... جو ہوا وہ بہت برا تھا.... مگر اب جو ہو گیا ہے.... وہ بدتر ہے....'' فراز نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں یہ جملے کہے اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ فراز اپنی بات کہہ کر خاموش ہو چکا تھا۔ میں نے الجھن کے عالم میں پلٹ کر حنا کی طرف دیکھا تو وہ بھی

مجھے ہی تکتی ہوئی نظر آئی....

''میں....میں کچھ سمجھا نہیں؟''میں نے الجھے ہوے لہجے میں پوچھا۔

فراز نے لمبا سانس لیا اور اپنی شرٹ کی جیب سے پین نکال کر ٹیبل پر رکھا۔وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پلٹ کر مجھے ایک نظر دیکھا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔

اس کے لب ہلے:

''چھبیس اکتوبر کی وہ رات کچھ زندگیوں کو ختم کر گئی.... مگر ایک اندھیرا زندہ کر گئی.... کچھ ایسا.... جس کا ہم انسان صدیوں سے انکار کرتے آرہے ہیں.... مگر اس کا وجود ہے....اور وہ مٹ نہیں سکتا۔''

یہاں تک کہہ کر فراز ٹھہر گیا اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''تم اس بات کو جانتے ہو کہ صبا کو بے دردی سے ٹکڑوں میں کاٹ دیا گیا تھا....اور پھر اس کے بچے ہوئے ٹکڑوں کو جلایا گیا تھا.... یہی حال اکمل کا ہوا....اسے بھی بری طرح ٹکڑوں میں کاٹ کر جلا....''

''پلیز۔پلیز۔!....''

میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیا،آنکھیں بھینچ لیں۔فراز میری کیفیت دیکھ کر ایک جھٹکے سے رکا۔حنا اس لمحے بالکل خاموش تھی۔جب کبھی مجھے اپنی بیوی اور اپنے بچّے کی موت یاد آتی تھی،میرا حال برا ہو جاتا تھا۔سانس جیسے اکھڑ جاتی تھی اور سر بھائیں بھائیں کرنے لگتا۔میں ان بھیانک یادوں سے اپنے آپ کو دور ہی رکھنا چاہتا تھا۔یہی بات فراز سمجھ گیا تھا۔

گہرا سانس لے کر اس نے میری طرف دیکھا اور پھر سے کہنا شروع کیا:

''اس دن سے تمھارے گھر میں.... عجیب وغریب چیزوں نے جنم لے لیا ہے....ہر رات گیارہ بجے کے قریب.... تمھارے گھر میں سے دھواں اٹھنے لگتا ہے....ایک عورت....اور بچّے کے چیخنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں.... آوازیں اس قدر شدید ہوتی ہیں.... کہ پورا محلہ تھرّ ا اٹھتا ہے.... کئی مرتبہ....لوگوں نے تمھارے مکان کی سیڑھیوں پر.... تازہ خون بہتے ہوے دیکھا ہے.... کئی مرتبہ راتوں کو.... بھیانک شیطانوں کے کرّاہنے کی آوازیں آتی ہیں.... جیسے دور....بہت دور.... کوئی بلا کرب سے تڑپ رہی ہو....روحیل.... تمھارا

گھر.... تمھارا گھر.... آسیب زدہ ہو چکا ہے۔''

فراز کا یہ کہنا تھا اور میں بے یقینی کے عالم میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔ اپنی بیوی اور اپنے بچّے کی موت کو یاد کر کے میرا برا حال ہو رہا تھا، مگر جب میں نے اس ساری بات کا Conclusion سنا تو خود بہ خود لبوں پر ایک گہری طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔ جنّات، بدروحیں، یہ سب باتیں میرے لیے محض بکواس تھیں اور جب کبھی ان باتوں پر بحث ہوتی تو میں صرف انکار ہی کرتا رہ جاتا۔ ابھی بھی شاید یہی ہونے والا تھا۔ میں نے فراز کا چہرہ دیکھا اور بے یقینی کے عالم میں میرے منہ سے نکلا:

''اچھا؟ آسیب زدہ؟''

''روحیل میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمھارے گھر میں ایک دن سے زیادہ آج تک کوئی ٹھہر نہیں سکا، اس گھر میں جانے والے ہر شخص کی موت ہوئی ہے۔ کوئی زندہ نہیں بچ سکا۔'' فراز نے خوف کے عالم میں مجھے سمجھانا چاہا۔

''فراز.... یہ سب باتیں جھوٹ اور بکواس ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ تم مجھ سے جھوٹ کہہ رہے ہو۔۔ مگر لوگوں نے تمھاری نظروں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔ خالی مکان اور خالی زمین دیکھ کر لوگ اسے ہتھیانہ چاہتے ہیں۔ مکان کو آسیب زدہ قرار دے کر کچھ لوگ اس زمین کو خریدنا چاہتے ہیں۔ میں پینتیس سال کا ہو چکا ہوں فراز، ان پینتیس سالوں میں، میں نے آج تک کسی آسیب کو نہیں دیکھا، اور جس قدر قصّے کہانیاں سنی ہیں وہ یا تو ٹی وی پر سنی یا ناولوں میں پڑھی ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم بھی اس من گھڑت کہانی پر یقین نہیں کرو۔'' میں کہتا چلا گیا۔

''تم سے زیادہ کراچی میں، میں رہا ہوں، یہاں لوگ کیا کر سکتے ہیں اور کیا کر جاتے ہیں، تم سے کہیں زیادہ میں سمجھتا ہوں۔ مگر اب تمھارے گھر میں کچھ ہے.... کچھ ہے ایسا جس کی وجہ سے Street 12 کے لوگوں نے گھر چھوڑ دیے۔ صرف تمھارا گھر ہی نہیں بلکہ محلہ ہی ویران ہو چکا ہے۔ اب وہاں کوئی نہیں رہتا۔'' فراز نے مجھے دیکھ کر بتایا۔

''ہاں روحیل۔'' حنا نے گفتگو میں دخل دیا اور کہنے لگی:

''Heavenly Vallies اب پہلے جیسی نہیں رہی ہے۔ Street 12 پر رہنے والا ہر مکان خالی ہو چکا ہے، لوگ اپنے بچّوں اور رشتہ داروں کو لے کر الگ ہو چکے ہیں۔ کوئی نہیں چاہتا

کہ اس کی اولاد دیوانی یا آسیبی ہو جائے۔ تمھارا گھر اب ایک جہنم بن چکا ہے۔ اس گھر میں اب آسیب کا سایہ ہے۔"

حنا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں یہ جملے کہے اور میں نے ایک نظر فراز کو دیکھا تو وہ مجھے ہی دیکھتا ہوا نظر آیا۔ میں طنزیہ مسکراہٹ اپنے چہرے پر لایا:

"لوگوں نے میری بیوی اور میرے بچّے کی موت کا کس طرح فائدہ اٹھایا ہے، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"روحیل...." فراز نے تنگ آ کر ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھا۔

"فراز.... میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں، اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

میں نے اسے دیکھ کر اپنا فیصلہ سنایا اور فراز میرا چہرہ تکنے لگا۔ حنا نے بھی مجھے دیکھا اور پھر فراز کو۔ میں خاموشی سے ان دونوں کے جواب کا منتظر تھا۔

فراز نے سرد آہ لی:

"چھ لوگ.... آسیب زدہ ہونے کے بعد.... چھے لوگ.... تمھارے مکان میں ایک رات گزارنے جا چکے ہیں اور ان چھے میں سے پانچ کی موت ہو گئی.... مکان میں داخل ہونے کے ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد ان سب کے ہارٹ فیل ہوئے ہیں۔ کسی ایک کو بھی قتل نہیں کیا گیا ہے.... لیکن.... ان چھ میں سے ایک شخص.... صرف ایک شخص.... زندہ بچ کر نکل آیا.... وہ بھی اس لیے کہ اس نے ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد دوسری منزل سے نیچے چھلانگ لگائی.... اور وہ سیدھا سڑک پر آ کر گرا.... جان تو بچ گئی.... مگر اس کی ریڑھ کی ہڈی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی.... وہ آج بھی زندہ ہے.... ہسپتال کے بستر پر پڑا.... اپنے باقی کے بچے کچے دن گن رہا ہے.... مگر کوئی فائدہ نہیں ہے.... کیوں کہ اب.... اب وہ کچھ کہہ نہیں سکتا.... کچھ بتا نہیں سکتا.... وہ ایک نفسیاتی مریض ہو چکا ہے، وہ.... پاگل ہو چکا ہے...."

فراز نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتا گیا اور میں فراز کا چہرہ تکنے لگا۔

"تمھیں اگر ہماری بات کا یقین نہیں تو ہم تمھیں اس شخص کے پاس لے کر چل سکتے ہیں۔ Its just a couple of blocks away۔ کیا کہتے ہو؟"

فراز نے مجھ سے پوچھا اور میں سوچنے لگا۔ حنا بھی مجھے ہی دیکھ رہی تھی کہ میں کیا فیصلہ کرتا

ہوں۔ میں نے گہرا سانس لیا اور ہاں میں سر ہلا دیا۔

☆......☆

تین سال پہلے چھبیس اکتوبر کی رات کو میری بیوی اور میرے بچّے کا بری طرح قتل کر دیا گیا تھا۔ میں اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا اور میری غیر موجودگی میں کسی نے یہ کام سرانجام دیا۔ قتل کرنے والے نے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا، نقدی اور زیورات کی بھوک شاید اسے نہیں تھی، ان حالات میں اس قدر بدترین قتل کیا گیا۔ وہ کون تھا؟ اس نے یہ بھیانک عمل کیوں کر کیا؟ میں نہیں جانتا تھا۔ کیوں کہ نہ تو ہمارا کوئی دشمن تھا اور نہ ہم کسی کے دشمن تھے۔ ان حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ کوئی دیوانہ یا پاگل شخص، پاگل خانے سے فرار ہو کر میرے گھر میں آدھمکا اور یہ عمل انجام دے ڈالا۔ مگر کسی پاگل خانے سے کسی پاگل یا دیوانے کے بھاگنے کی اطلاع پولیس کو نہیں ملی۔ اس دن سے میری زندگی جیسے ویرانوں میں بھٹک رہی تھی، میرا کوئی دشمن نہیں تھا، میں نے کسی کا حق نہیں مارا تھا۔ پھر بھی نجانے کس نے میرے ہنستے کھیلتے آنگن میں آگ لگا دی اور سب کچھ بکھر کر رہ گیا۔ اس دن سے میں یہ شہر چھوڑ کر دبئی چلا گیا اور واپس پلٹ کر نہیں آیا۔ مگر کچھ یادیں.... کچھ یادیں تھیں جو مجھے بار بار اپنے گھر کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ میں اپنے آپ کو روک نا سکا اور ایک ہفتے کی چھٹی پر کراچی چلا آیا۔ مگر یہاں آکر جو میں نے اپنی بہن حنا اور بہنوئی فراز کے منہ سے سنا وہ بے انتہا عجیب تھا۔ مجھے بچپن سے ہی آسیبوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی میں ان پر ایمان رکھتا تھا۔ کراچی ایک خطرناک شہر ہے جہاں انسانوں کو انسانوں سے ہی ڈر اور خوف ہوتا ہے، تو آسیب بچاروں کے لیے بچا کیا تھا اس شہر میں؟ میں اس سچ اور حقیقت کو دل سے مان رہا تھا کہ میرے گھر پر کسی آسیب کا وجود نہیں بلکہ دراصل پراپرٹی پر قبضہ کرنے کے لیے کسی کی سازش ہے۔ گویا مجھے اپنی یادوں کے لیے.... اپنے آنگن کے لیے لڑنا تھا۔

اس وقت میں فراز اور حنا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا ہوا قریبی ایک سرکاری ہسپتال کی طرف رواں دواں تھا۔ جہاں مجھے ایک ایسے شخص سے ملاقات کرنی تھی جو میرے ہی گھر میں چوبیس گھنٹے کا مہمان بن کر رہا تھا مگر بعد میں اسے زندگی بھر کا پاگل پن قبول کرنا پڑا۔ جلد ہی ہم تینوں ہسپتال کے کوریڈور کراس کرتے ہوئے پرائیوٹ وارڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کئی ڈاکٹر اور نرس اس وقت ہمارے پاس سے گزر کر جا چکے تھے۔ آخر کار ہم ایک وارڈ میں داخل ہوئے۔ فراز مجھے

سیدھا ایک بستر کی جانب لے گیا جس کے چاروں طرف پردہ پڑا ہوا تھا۔فراز نے پردہ ہٹایا اور میں نے دیکھا کہ ایک شخص جس کی عمر بامشکل چالیس پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی مردہ جسم لیے پڑا تھا۔اس کا جسم کانٹے کی طرح سوکھ چکا تھا اور چہرے کی ہڈیاں اس قدر واضع ہوگئی تھیں کہ اس کی کھوپڑی بخوبی نظر آرہی تھی۔اس وقت وہ ستّر اسّی سال کا ایک بوڑھا شخص لگ رہا تھا۔

’’مسٹر جمیل؟ مسٹر جمیل کیا آپ مجھے سن سکتے ہیں؟‘‘

فراز نے اس کے قریب ہوکر پوچھا مگر وہ چھت کو تکتا رہا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

’’تین گھنٹے تک گلی میں مسٹر جمیل بے ہوش پڑے رہے، کوئی انہیں بچانے والا نہیں تھا.... کسی کو امید بھی نہیں تھی کہ یہ بچ جائیں .... مگر یہ زندہ ہیں .... لیکن کسی موت سے کم نہیں۔مسٹر جمیل سب کچھ کھو چکے ہیں .... اپنا گھر .... اپنی زندگی .... اپنا خاندان .... بس انتظار ہے تو موت کا۔‘‘ حنا نے غمگین لہجے میں بتایا اور میں نے مسٹر جمیل کی طرف دیکھا تو وہ خاموشی سے پڑا ہوا نظر آیا۔

’’کیا مسٹر جمیل نے گھر کے بارے میں کوئی بات کہی؟‘‘

میں نے ان دونوں کو دیکھ کر پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘ فراز نے نفی میں سر ہلایا پھر بولا:

’’کچھ نہیں کہا کسی سے، دن بھر یہ اسی طرح پڑے رہتے ہیں یا پھر....‘‘

فراز یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اچانک مسٹر جمیل پاگلوں کی طرح چیخنے چلّانے لگا۔

ہم تینوں بُری طرح اچھلے۔

مسٹر جمیل کا جسم بستر پر تڑپ رہا تھا اور وہ بے انتہا بھیانک طریقے سے چلّا رہا تھا۔میں آنکھیں پھاڑ کر یہ منظر دیکھنے لگا۔جلد ہی ڈاکٹروں کی ایک ٹیم اندر دوڑ کر آئی اور مسٹر جمیل کے جسم کو تھامنے کی کوشش کرنے لگی۔

’’آہ!! آہ!....‘‘

جمیل کرب میں چیخا۔

سب دہشت کے عالم میں اسے تکنے لگے۔میں بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

’’نن!!.... نہی!!.... آہ...!‘‘

جمیل خوف کے عالم میں پھر چیخا اور ایک دم سے اس کا جسم ساکت ہوگیا۔ ہم مستقل آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔مسٹر جمیل جو پچھلے کئی سالوں سے زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا، آخرکار مر ہی گیا۔ گویا گھر میں داخل ہونے والے ہر شخص کی موت ہو چکی تھی۔ڈاکٹروں نے سفید چادر اس کے چہرے پر ڈال دی اور میں دہشت زدہ ہوکر یہ منظر دیکھتا رہ گیا....

☆......☆

رات بہت گہری تھی اور چاروں طرف خاموشی نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب ہم تینوں خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد حنا خاموشی سے اٹھ کر چائے بنانے کے لیے چلی گئی جبکہ میں فراز کے ساتھ موجود تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا، بس خاموش بیٹھے رہے۔حنا چائے لے کر آئی تو جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوئی:

''نجانے.... نجانے.... مسٹر جمیل پر کیا گزری ہوگی....''

اس کی بات سن کر فراز نے سر ہلایا:

''ہم نہیں جانتے کہ ان کیساتھ کیا ہوا.... کیا وہ انسانی عمل تھا؟ یا جنّاتی؟ مگر وہ جو بھی عمل تھا.... کسی کی جان لے گیا.... اور ہمیں اپنے جانوں کی حفاظت کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ House No. 24/10 on Street 12 آسیب میں گھر گیا ہے یا نہیں.... ہم نہیں جانتے.... مگر اب وہ جگہ رہنے کے قابل نہیں رہی۔''

فراز کی بات سن کر میں خاموش رہا اور چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔

''روحیل؟ اب تو تم واپس اپنے گھر نہیں جانا چاہتے نا؟''

حنا نے مجھے دیکھ کر پوچھا اور میں نے حنا کی طرف دیکھا۔

فراز بھی میرے جواب کا منتظر تھا۔

میں نے سرد آہ لی اور کہا: ''کل صبح میں اپنے گھر واپس جا رہا ہوں۔''

میرا جواب سن کر حنا اور فراز دونوں دھک سے رہ گئے۔

سکتے کے عالم میں میرا چہرہ تکنے لگے۔

''ہاں.... میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''اتنا سب کچھ جاننے کے بعد بھی؟'' فراز نے حیران ہوکر پوچھا۔

’’ہاں ....اتنا سب کچھ ہونے کے بعد ہی تو جانا چاہتا ہوں .... یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کا تعلق مجھ سے ہے....اس کی دشمنی مجھ سے ہے....اگر میں نہیں گیا تو نجانے کتنے ہی لوگ مریں گے.... نجانے کتنے ہی گھروں کے چراغ گل ہوں گے.... Somebody has to stop this once and for all, and that somebody would be me، میں نے کل صبح واپس اپنے گھر جانا ہے۔‘‘

میرے لہجے کی مضبوطی کو سن کر فراز اور حنا خاموش ہوگئی۔

’’فراز، حنا۔ میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں کو مجھ سے بہت محبت ہے....اور تم لوگ میرے بھلے کے لیے ہی مجھے روکنا چاہتے ہو.... مگر میرا یقین کرو.... میرے کچھ اپنے اس گھر میں ابھی بھی ہیں....اور انہیں کے ساتھ ساتھ میرے کچھ دشمن ابھی بھی زندہ ہیں.... مجھے اپنے ماضی سے لڑنا ہوگا....ورنہ میں بھی کسی دن مسٹر جمیل کی طرح بستر پر دم توڑ دوں گا....اور میں یہ نہیں چاہتا۔‘‘

میری بات سن کر دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ میں بھی خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ کچھ ہی پل گزرے ہوں گے کہ فراز نے ہار مان کر کہا:

’’ٹھیک ہے....اگر تمھارا یہی فیصلہ ہے تو.... ٹھیک ہے۔‘‘

فراز کی بات سن کر میں مسکرا دیا پر حنا کا چہرہ فق پڑ گیا۔ میں جانتا ہوں کہ میری بہن میرے لیے فکرمند ہے، مگر میں کل صبح اپنے گھر جانے والا تھا، اور مجھے وہاں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

☆......☆

Chapter 2

اگلی صبح ساڑھے سات بجے میں فراز اور حنا کے ساتھ اپنے گھر کی طرف روانہ تھا۔ میرے دماغ میں کئی باتیں چل رہی تھیں۔ یہ بات طے تھی کہ میرے گھر کے حالات عجیب وغریب ہیں۔ یہی سوچ کر میں اپنے اندر ایک جوش بھی محسوس کر رہا تھا کیوں کہ میری ملاقات میرے دشمن سے ہونے والی تھی۔ جس شخص نے میرے آنگن میں آگ لگا دی تھی اب مجھے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملنے والا تھا، اور میں اس موقع کے لیے تیار تھا۔ فراز اور حنا اس لمحے میں خاموشی سے سفر کر رہے تھے۔ آخر کار میرا علاقہ Heavenly Vallies شروع ہوا اور ایک ایک کر کے اسٹریٹس گزرنے لگیں۔ پہلے اسٹریٹ ون، پھر اسٹریٹ ٹو، پھر اسٹریٹ تھری اور اسی طرح کرتے کرتے اسٹریٹ ٹین آ گئی۔ اسٹریٹ ٹین وہ آخری اسٹریٹ تھی جہاں زندگی کی لہر ہم نے محسوس کی۔ کیوں کہ اسٹریٹ الیون بالکل سنسان اور وحشت زدہ تھی، شاید اسٹریٹ ٹویلو کی وجہ سے اسٹریٹ الیون بھی بری طرح اثر انداز ہوئی تھی۔

آخر کار ہم اسٹریٹ ٹویلو پر پہنچے اور یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ جو سڑک ہر وقت رونق زدہ رہتی تھی اب اجڑی پڑی ہے۔ ہر گھر ویران تھا، سڑکیں ٹوٹ چکی تھیں، یہاں تک کے پھول، پودے اور درخت بھی جنگلی پتوں میں تبدیل ہو گئے۔ یہ وہ گلی تھی ہی نہیں جسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ گھر کے لان میں موجود مالی باغوں کا خیال رکھا کرتے تھے، بچّے سڑک پر کرکٹ اور فٹبال کھیلا کرتے تھے، چھوٹی چھوٹی بچّیاں سائیکل چلایا کرتی تھیں، کئی لوگ اپنے پالتو جانوروں کو ٹہلانے کے لیے نکل پڑتے تھے اور گھر کی عورتیں گھروں کے کام کرتی

تھیں۔مگراب یہاں کچھ نہیں تھا،بس ایک ویرانی تھی....ایک وحشت زدہ ویرانی۔گھروں کی کھڑکیاں ٹوٹی پڑی تھیں اور دروازے بھی کھلے پڑے تھے بڑے بڑے مکڑیوں کے جالے اور پرندوں کے گھونسلے ہی اب ان گھروں کی زینت تھے۔فراز خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا،حنااس لمحے بہت ڈرگئی تھی مگراس نے کچھ کہا نہیں۔

ہم House No. 24/10 پر پہنچے اور یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسوامڈآئے کہ جس گھرکوصبانے ہمیشہ جنّت بنا کر رکھا وہ اب کسی دوزخ سے کم نہیں لگ رہا تھا۔گھرکی دیواروں میں شگاف پیدا ہوگئے تھے اور پلستر بھی اکھڑ گیا۔زندگی نام کی چیزاب اس گھر میں نہیں تھی،ایسے میں اگرکوئی یہ سوچ اپنے دماغ میں پیدا کرے کہ یہاں کوئی آسیب رہتا ہے تو واقعی دل تھرّ ادینے والی بات ہے مگر میں ایسی بیوقوفانہ سوچ اپنے ذہن میں نہیں لا رہا تھا۔آخر کار ہم تینوں اتر کر گھر کے دروازے کی طرف بڑھے۔مرکزی دروازہ مقفل تھا اور اس کو دیکھ کر احساس ہورہا تھا کہ جیسے....جیسے یہ صدیوں سے نہیں کھلا ہو۔

”دروازہ کھولوں؟“

فراز نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا اور میں نے ہاں میں سر ہلایا۔میرا حکم سن کر فراز نے دروازے کے لاک میں چابی لگائی اور دروازہ ایک کھٹکے سے کھلا۔لاک کھلنے کی آواز پورے گھر میں گونجی تھی۔اسی گونج کے ساتھ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو ٹھیک آٹھ بج رہے تھے۔گویا میرے چوبیس گھنٹے شروع ہو چکے تھے اور پچیسواں گھنٹہ ایک بہت بڑے راز پر سے پردہ ہٹنے والا تھا۔فراز نے دروازہ کھولا اور دھول اڑنے لگی۔حنا کو ہلکی سی کھانسی ہوئی اوراس نے میرے ساتھ قدم اٹھائے۔کندھے پر بیگ لٹکائے میں اندرآیا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔میری آنکھوں کے سامنے ایک چھوٹا سا کمرا تھا جہاں صوفہ سیٹ مٹی میں اٹے پڑے تھے۔صوفے کے برابر میں ٹیبل لیمپ،ٹیوی،اورمسیری وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔گھر کی گھڑیاں اس وقت بند پڑی تھیں، شاید گھر کی ساری الیکٹرانک چیزیں خراب ہوکر رہ گئی تھیں۔ناک کی سیدھ میں اسٹور روم تھا اور اسٹور کے دائیں ہاتھ پر کچن موجود تھا۔کچن سے ایک دروازہ باہر Junk-Yard کی طرف جاتا تھا جہاں ہم کچرے کے ڈبے اور دیگر غیر ضروری سامان ڈال دیتے تھے۔کچن کے برابر میں میرے بیٹے اکمل کا کمرا تھا جس کا دروازہ بند پڑا تھا۔اکمل کے کمرے کے بالکل سامنے سیڑھیاں

اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ سیدھی سیڑھیاں ایک راہداری پر آ کر رکتیں جہاں ایک بڑی کھڑکی موجود تھی، اور پھر سیڑھیاں اوپر والی منزل کی طرف بڑھ جاتیں۔ میں اندر آیا اور ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ فراز اور حنا بھی ہر چیز کو دیکھ رہے تھے۔

گھر کے فرش پر مٹی کی تہہ اس قدر جمی ہوئی تھی کہ اس پر ہمارے قدموں کے نشان چھپ رہے تھے۔

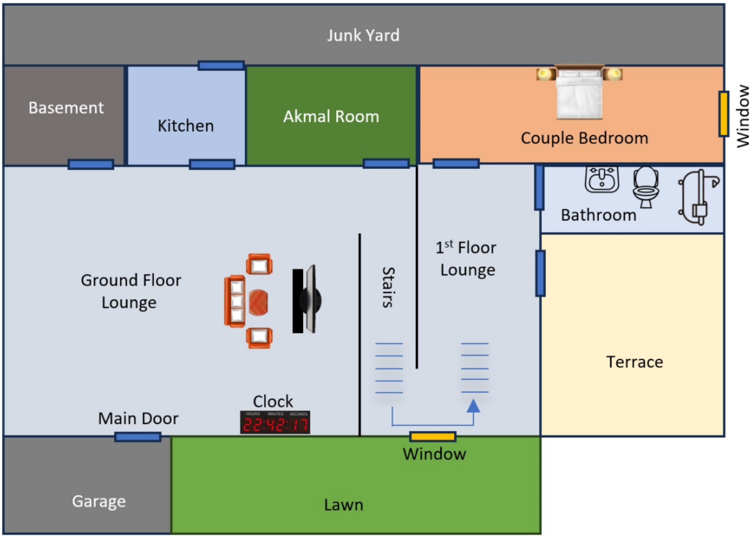

”اُف.... توبہ.... گھر بہت گندا ہو رہا ہے.... یہ رہنے کے قابل نہیں رہا۔“

حنا نے کھانستے ہوئے یہ جملے کہے اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔

”ظاہر سی بات ہے، پچھلے آٹھ مہینوں سے یہاں کوئی نہیں آیا۔ آٹھ مہینے پہلے بھی صرف مسٹر جمیل ہی آئے تھے۔“ فراز نے اسے دیکھ کر کہا۔

”روحیل؟ کیا تم ابھی بھی یہاں رکنا چاہتے ہو؟“ حنا نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”ہاں....“ میں نے مختصر جواب دیا اور حنا جھنجلا کر نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔

میں آگے بڑھا اور کچن کی طرف دیکھا تو کیبنٹس اور ٹیبل بھی مٹی میں اٹی پڑی نظر آئی۔ اب میری نظر اسٹور روم کی طرف پڑی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسٹور روم کا دروازہ کھولنا چاہا۔ دروازے کا ہینڈل پکڑ کر میں نے کھینچا تو وہ کھلتا چلا گیا، میں نے دیکھا سیڑھیاں نیچے ہی نیچے چلی

جارہی تھیں۔ یہ ہمارے گھر کا بیس منٹ تھا جسے تہ خانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اکثر ہم گھر کی ضروری چیزیں اسی بیس منٹ میں رکھتے تھے، مثال کے طور پر جھاڑو، فرش صاف کرنے کا وائپر، گاڑی کی ضروریات کی چیزیں، تیل، پیٹرول، اوزار، بریک آئل وغیرہ۔

اب میں اپنے بیٹے اکمل کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا میں اس کے کمرے کے سامنے پہنچا۔ اس کے کمرے کا دروازہ اداس شکل لیے میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر کھینچنا چاہا تو وہ نہیں کھلا۔ میں نے ایک دو بار ہینڈل کھینچا مگر دروازہ جیسے جام ہو گیا تھا۔

''ایک سیکنڈ.... میں کھولتا ہوں....''

فراز نے آگے بڑھ کر یہ جملے کہے اور دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ نہیں کھلا۔

''کہیں یہ لاک تو نہیں ہے؟'' حنا نے ہمیں دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں لاک تو نہیں ہے، شاید کہیں پھنس رہا ہے۔'' فراز نے کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"Forget It Faraz۔ بعد میں دیکھ لیں گے۔''

میں نے اکتا کر یہ جملے کہے اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔

اب میں اوپر کی طرف بڑھا اور ایک ایک کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میرا ایک ایک قدم مجھے اپنی خواب گاہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں خاموشی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچا۔ راہداری میں پہنچا تو میرے سامنے اب کھڑکی تھی جس سے باہر گلی کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ کھڑکی کے شیشے ٹوٹے پڑے تھے۔ میری کمرے کے بالکل عین پیچھے مزید سیرھیاں اوپر کی طرف جا رہی تھیں، میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر والی منزل میں آ گیا۔ میں نے دیکھا، میرا اور صبا کا کمرا میرے سامنے موجود تھا اور اس کمرے کے برابر میں ایک باتھ روم اور باتھ روم کے برابر میں ٹیرس۔ میں چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور اس کے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر کھولنا چاہا۔ اس بار دروازہ چر چراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ میں نے اندر نظر ڈالی اور اپنا بستر دیکھا۔ ڈریسنگ ٹیبل ابھی بھی اسی طرح موجود تھی جس طرح میں اسے چھوڑ کر گیا تھا، صبا ہر وقت اس کے

سامنے بیٹھی رہتی تھی اور آئینے سے اپنے حسن کا مقابلہ کرتی رہتی، جبکہ میں منہ بنا کر اس کا بستر پر انتظار کرنے لگتا۔ انتظار کی یہ گھڑی مجھے ہمیشہ اذیت دیتی تھی مگر صبر کا پھل بہت میٹھا ہوتا ہے۔ بن سنور کے جب صبا آئینے کے سامنے سے ہٹ کر میرے پاس آتی تھی تو کسی حور سے کم نہیں لگتی تھی اور میں اسے تھام کر پیار کی وادیوں میں ڈوب جاتا۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے اپنا گھر، اپنی زندگی، اپنی ایک ایک میٹھی بات یاد آ رہی تھی۔ اس وقت میں سکتے کے عالم میں بستر کو تک رہا تھا۔

''یاد آ رہی ہے وہ؟''

فراز نے میری حالت دیکھ کر مجھ سے پیار سے پوچھا اور میں نے پلٹ کر اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ تھی۔ میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی مگر اسی کے ساتھ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

''روحیل....''

حنا نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھالا اور میں حنا کے گلے لگ گیا۔ حنا بھی اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکی اور رونے لگی۔ فراز نے آگے بڑھ کر میرے شانوں پر ہاتھ رکھا:

''روحیل.... جو ہو گیا سو ہو گیا.... اب تم یہاں دوبارہ سے اپنی ایک نئی زندگی کی شروعات کر سکتے ہو۔ چلو ہم مل کر اس گھر کو صحیح حالات میں لائیں۔''

''ہاں فراز، گھر کا صاف ہونا بہت ضروری ہے، بلکہ رات کا کھانا بھی ہم یہیں کھائیں۔ کیوں روحیل؟''

حنا نے مجھ سے پوچھا اور میں نے اپنے آنسو پونچھے اور ہاں میں سر ہلایا مگر اچانک سے میری نظر ایک چیز پر جم کر رہ گئی۔

''کیا ہوا؟''

فراز نے حیران ہو کر پوچھا اور پلٹ کر دیکھا تو وہ بھی حیران رہ گیا۔ حنا نے بھی پلٹ کر دیکھا تو وہ بھی بھنویں چڑھا کر دیوار کو تکنے لگی۔ ہم تینوں نے صاف دیکھا، دیوار پر انگریزی

حروف میں لال رنگ سے کچھ لکھا ہوا تھا: rEdruM of sTerceS۔

☆......☆

دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ حنا اور فراز کے ساتھ مل کر میں گھر کا نقشہ کافی حد تک واپس لے آیا تھا۔ بیس منٹ سے سیڑھی لا کر میں نے گھر میں لگے بلب تبدیل کیے تھے جس سے گھر جگمگانے لگا۔ حنا نے باورچی خانے کی ذمہ داری لے لی جبکہ فراز نے گھر میں جھاڑو لگانے کی ذمہ داری لی تھی جسے دیکھ کر میں اور حنا اپنی ہنسی روک نہ سکے۔ سیڑھی کی ہی مدد سے میں نے دیواروں پر لگی گھڑیوں میں سیل ڈالے تو وہ بھی صحیح وقت بتانے لگیں۔ لاؤنج میں بڑی سی ڈیجیٹل کلاک جو کہ صبا کو بہت پسند تھا صحیح ہو گیا۔ کالا ڈیجیٹل کلاک جس پر لال Digits بالکل روشن تھے۔ صبا کو ایک پل یاد کرنے کے بعد میں سیڑھی سے نیچے اتر گیا۔ اس دوران میں نے اور فراز نے مل کر کئی مرتبہ اکمل کے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ کھل کر نہ دیا۔ نجانے دروازہ کہاں اٹک گیا تھا جو

کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔اکمل کے کمرے سے ہار مان کر میں اور فراز اوپر والی منزل پر پہنچے اور بیڈ روم میں جا کر صابن اور ڈٹرجنٹ سے رگڑ رگڑ کر انگریزی حروف کو مٹانے کی کوشش کرنے لگے۔مگر ہماری یہ کوشش بیکار ثابت ہوئی۔الفاظ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔

''روحیل۔۔مجھے لگ رہا ہے تجھے یہاں پینٹ کرانا پڑے گا۔''

فراز نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ہاں مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔''میں بڑبڑایا۔

''مگر ان حروف کا مطلب ہے کیا؟''فراز نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پتا نہیں،شاید محلّے کے بچّوں نے گھر میں گھس کر یہ شرارت کی ہے۔''

میں نے سوچتے ہوئے خیال پیش کیا۔

''اتنا اوپر بچّے کیسے لکھ سکتے ہیں؟اکمل بھی صرف دو سال کا تھا۔وہ یہ جملے لکھ سکتا تھا نہ ہی اس کا ہاتھ اتنا اوپر جاتا۔''فراز کے منہ سے بھی حیرت کے عالم میں نکلا۔

''ہوسکتا ہے ان چھے آدمیوں میں سے کسی ایک کی یہ حرکت ہو جو یہاں مہمان بن کر ٹھہرے تھے....''میں نے فراز کو دیکھ کر خیال پیش کیا۔

''ہاں شاید،چلو خیر ہے ابھی کون سا یہاں کوئی مہمان آرہا ہے۔تم اطمینان سے یہ کام کرا سکتے ہو۔''فراز نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''باہر کا پینٹ بھی دوبارہ سے کروانا ہے۔گھر باہر سے بہت گندا ہو گیا ہے۔''

میں نے دیواروں کو دیکھتے ہوئے جائزہ لیا۔

''ویسے دوپہر کا ایک بج گیا ہے۔ہمیں یہاں آئے ہوئے پانچ گھنٹے ہو گئے ہیں اور ابھی تک تو کوئی عجیب واقعہ ہوا نہیں۔''فراز نے اطمینان سے مجھے دیکھا۔

''اور ان شاء اللہ ہوگا بھی نہیں۔سب سالے ڈرامے کرتے ہیں زمین ہتھیانے کے چکّر میں۔''میں نے غصیلے لہجے میں اپنی بات کہی اور فراز بھی گردن ہلا کر رہ گیا۔شاید اس کا ذہن میری بات اب سمجھ رہا تھا۔

''چلو چھوڑو ان باتوں کو،سگریٹ لوگے؟''میں نے سگریٹ کی ڈبّی نکال کر پوچھا۔

''یار حنا آجائے گی۔''فراز نے گھبرا کر کمرے سے باہر دیکھا۔

''نہیں وہ کچن میں کھانا بنا رہی ہے، اوپر نہیں آئے گی۔''
میں نے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔
''لا پھر۔ ایک سٹّہ تو بنتا ہے۔'' فراز نے ہاتھ مسلتے ہوئے یہ جملے کہے اور میں ہنس پڑا۔
ایک ایک سگریٹ لگا کر اب ہم نیچے کی طرف چلے۔ کچن میں داخل ہوئے تو میرا خیال صحیح ثابت ہوا۔ حنا بے چاری اکیلی کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی۔
''ہاں جی حنا صاحبہ کیسی گزر رہی ہے کچن میں؟'' میں نے اسے دیکھ کر پوچھا۔
''بہت گندی۔ ویسے تو کسی آسیب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اگر آسیب یہاں رہتے ہیں تو پلیز ان سے کہو کے صفائی کا خیال رکھا کریں۔'' حنا نے جل کر یہ جملے کہے اور ہم ہنس پڑے۔
''نہیں سچ میں، یہ گندا گھر مجھے فراز کی کنواری زندگی کی یاد دلا گیا ہے۔'' حنا نے جل کر کہا۔
''ارے؟ بیکار کا الزام! بیگم جی ہم اپنے کنوارے پن میں بھی صاف ستھرے تھے....''
فراز نے ہاتھ چلا کر کہا۔
''کیوں جھوٹ بول رہے ہیں فراز؟ آپ کو آدھا انسان تو میں نے ہی بنایا ہے۔''
حنا نے مسکرا کر ہنڈیا چلاتے ہوئے کہا۔
''ہاں فراز یہ بات تو ہے، تم ہماری بہن کی خدمات کو اگنور نہیں کر سکتے۔''
میں نے مسکرا کر کہا۔
''چلو مان لیتے ہیں بھئی کہ ہمیں انسان آپ نے بنایا ہے، اسی بات پر اچھا سا کھانا کھلا دو بس۔'' فراز نے منہ بنا کر کہا۔
''آپ دونوں ہاتھ منہ دھو لیں، کھانا بس تیار ہے۔'' حنا نے مسکرا کر کہا۔
''روحیل کیا خیال ہے؟ ایک بار پھر اکمل کے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کریں؟''
فراز نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔
''نہیں یار بیکار میں تھکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل کارپینٹر کو بلا لوں گا۔''
میں نے پانی پیتے ہوئے جواب دیا۔
''ہاں شاید دروازے کی لکڑی موٹی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے جام پڑ گئی۔''
فراز نے خیال پیش کیا۔

''ان شاء اللہ اب سب صحیح ہوگا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں یہ جملے کہے اور ایک بار پھر لاؤنج میں آ کر کام میں لگ گیا۔

☆......☆

رات کے نو بج گئے اور گھر ایک دم پرفیکٹ ہوگیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ایک بار پھر سے ہم تازہ دم ہو چکے تھے اور اب رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ دھیمی روشنی میں گھر میں انتہائی پرسکون ماحول بن چکا تھا۔ جو گھر مٹّی اور دھول سے اٹا پڑا تھا اب صاف ستھرا تھا۔ البتہ ٹیوی ابھی تک خراب تھا، اکمل کا کمرا ابھی تک نہیں کھلا اور اوپر میرے کمرے پر انگریزی حروف ابھی بھی موجود تھے۔ بہرحال پہلے دن ہی کافی کام سمٹ گیا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ٹھیک ہو جانے تھے۔

حنا نے بڑی محنت سے چکن بریانی بنائی ہوئی تھی اور ہم تینوں رائتے کے ساتھ بریانی کے مزے لے رہے تھے۔

''آہ.... گاڈ.... حنا میں نے بہت عقل مندی کی ہے تم سے شادی کر کے، ورنہ اتنی مزیدار بریانی کھانے کو کہاں ملتی۔'' فراز نے بریانی کھاتے ہوئے تعریف کی۔

''سچ میں، حنا نے آج کچھ زیادہ ہی مزیدار بریانی بنائی ہے۔''

میں نے بھی کھاتے ہوئے کہا۔

''اب قدر کریں آپ دونوں میری۔'' حنا نے مسکرا کر کہا۔

''بھائی سچ میں اگر گھر کی عورت کو کھانا اچھا بنانا نہ آتا ہو تو زندگی تباہ و برباد ہو جائے۔''

فراز نے سر ہلا کر کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں۔ گھر بس عورت سے ہی چلتا ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اس لیے اب باری آ گئی ہے روحیل کہ تم شادی کر ہی لو۔'' حنا نے مسکرا کر کہا۔

''ویل اہم۔'' میں شرمانے لگا۔

''ارے کیا اہم؟؟ بس اب جلدی سے شادی کر لو تا کہ ایک بار پھر سے اپنی زندگی ہنسی خوشی بسر کر سکو۔'' فراز نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''ہاں روحیل، ویسے بھی بہت دن ہو گئے مزے کیے ہوئے۔ میں تمھاری شادی میں تو اس بار بہت ناچوں گی....'' حنا نے جوش میں آ کر کہا۔

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ فالحال ابھی مجھے اس گھر میں آئے ہوئے چوبیس گھنٹے پورے

نہیں ہوئے، جبکہ ان چوبیس گھنٹوں میں ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگا۔''

میں نے سوچتے ہوئے ڈیجیٹل کلاک کی طرف دیکھا۔

''بھئی رات کے دس بجنے کو آرہے ہیں، گویا چودہ گھنٹے تو پورے ہو چکے ہیں بس دس گھنٹے بچے ہیں۔ وہ بھی گزر جائیں گے۔'' فراز نے ہاتھ چلا کر کہا۔

''ہاں مگر ابھی بھی دس گھنٹے ہیں۔'' میں نے گھڑی کو دیکھ کر کہا۔

''نہیں روحیل....'' حنا نے میرا نام لیا پھر کہنے لگی:

''اب تو مجھے تمھاری بات بالکل صحیح لگ رہی ہے کہ یہاں کچھ نہیں ہو رہا۔ مطلب جن بھوت ہوتے تو کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا۔ کہیں سے کالی بلّی نکل آتی، پانی کی جگہ خون آجاتا، دودھ پھٹ جاتا، بریانی میں کیڑے پڑ جاتے۔'' حنا کہتی چلی گئی۔

"Hey Hey Hey I'm Eating"۔ فراز نے آنکھیں نکال کر کہا۔

''سوری۔'' حنا ہنس کر بولی۔

''ہاں تم صحیح کہہ رہی ہو، اب تک تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سمجھ نہیں آرہا کیوں کر ان چھے لوگوں کے دل بند ہو گئے۔''

میں بڑبڑایا اور کچھ سوچ کر فراز سے مخاطب ہوا: ''فراز وہ کون لوگ تھے؟''

''میں بتاتا ہوں۔'' فراز نے پلیٹ رکھی اور نوالا نگل کر بولا:

''پہلے تو مسٹر محمد وقاص آئے تھے۔ عجیب عامل آدمی تھا مگر بہادری اس کی مشہور تھی۔ موٹا، مضبوط اور سڈول جسم، جلد کا رنگ سیاہ اور لمبا قد۔ یہ شخص تمھاری ہی سوچ لے کر گھر میں آیا تھا کہ یہاں جنّات کا کوئی بسیرا نہیں۔ اور اگر جنّ بھوت ہیں بھی تو وہ ان کو چلتا کر دے گا۔ مگر اگلے دن اس کی لاش گھر کے لان میں پڑی ملی۔ ڈاکٹر نے وجہ موت ہارٹ اٹیک بتایا۔''

''اوہ.... اوکے؟'' میرے منہ سے نکلا اور سوچنے لگا۔

''دوسرا شخص ڈاکٹر عدیل تھا۔ درمیانہ قد، معصوم چہرہ، گورا اور پڑھا لکھا۔ یہ ایک سائی کیٹرسٹ تھا اور مسٹر محمد وقاص کی موت کی وجہ دماغی خلل قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مسٹر وقاص ڈر گیا اور دل کے دورے کا شکار ہوا۔ اسی بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ اس گھر میں داخل ہوا مگر ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد ان کی لاش لاؤنج میں پڑی ملی۔ ڈاکٹر عدیل کو بھی دل کا دورہ پڑا تھا۔''

فراز کہتا چلا گیا اور میں خاموشی سے اسے تکنے لگا۔

حنا میری طرف دیکھنے لگی۔

''تیسرا شخص یوسف تھا۔ یہ ایک بھکاری قسم کا آدمی تھا۔ جوانی میں جرائم پیشہ بھی رہا۔ بدنصیب اسی دن جیل سے رہا ہو کر باہر آیا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور کپڑے پھٹے ہوئے۔ سر چھپانے کے لیے گھر میں غلطی سے داخل ہو گیا۔ اسے کسی بات کا علم نہ تھا اور وہ جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ کیسے گھر میں داخل ہوا ہے۔ صبح اس کی لاش بھی اسی لاؤنج میں پڑی ملی۔ جسم اکڑ گیا تھا، ڈاکٹروں نے بتایا کہ موت شدید سردی کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے مگر بعد میں معائنہ کرنے کے بعد یہ بات صاف ہو گئی کہ وجہ موت، دل کا دورہ ہی تھا۔ اس کے بعد یہ بات پورے شہر میں مشہور ہو گئی کہ مکان نمبر چوبیس بٹا دس پر جنّوں کا سایہ ہے، اس لیے یہاں اب کوئی نہیں آتا۔ دھیرے دھیرے محلہ ویران ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسٹریٹ بارہ بھی اس آسیب کا شکار ہو گئی ہے۔''

فراز کہتا چلا گیا۔

''او کے۔۔باقی کے تین؟''میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''پھر اس گھر میں داخل ہوئے دو بھائی ندیم اور سلیم۔ دونوں یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس تھے اور اپنے دوستوں سے شرط لگا کر اس گھر میں داخل ہوئے۔ شرط یہ تھی کہ اگر چوبیس گھنٹے بعد وہ اس گھر سے زندہ نکل آئے تو یونیورسٹی کی ایک خوبصورت لڑکی نادیہ کے ساتھ ڈیٹ پر جائیں گے۔ اگر وہ ہارے تو انہیں کپڑے اتار کر بھری کلاس میں ناچنا پڑے گا۔''

فراز کی یہ بات سن کر میں اور حنا بے ساختہ ہنس دیئے۔

''تفریح اور مزاحیہ قسم کے یہ دو بھائی گھر میں داخل ہو تو گئے مگر ہوا وہی۔ دو میں سے ایک کی لاش لاؤنج میں پڑی ملی اور دوسرے کی بیس منٹ میں۔''

فراز نے بیس منٹ کی طرف دیکھتے ہوئے یہ جملے کہے۔ میں اور حنا بھی گردن گھما کر بیس منٹ کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

''وجہ موت؟ ہارٹ اٹیک۔''فراز نے ٹھہر کر کہا اور میں سوچنے لگا۔

''اب بچے اس کہانی کے آخری کھلاڑی مسٹر جمیل۔ مسٹر جمیل لوکل اخبار کی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ قلم ہی ان کے لیے سب کچھ تھا مگر صرف قلم کے سہارے وہ اپنی بیوی اور تین بچّوں

کا خرچہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ دور بدل گیا ہے، اب لوگ ویب سائٹ اور یوٹیوب زیادہ دیکھتے ہیں۔ جو لوگ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ان کے لیے جینا اتنا آسان نہیں۔ اس لیے انہیں کچھ کام چاہیے تھا۔ کچھ ایسا جس سے ان کی زندگی آگے بڑھ سکے۔''

فراز نے مجھے دیکھ کر یہ جملے کہے پھر بولا:

''علاقے کے ناظم سے انہوں نے بات کی اور کہا کہ اگر وہ اس آسیب کو بھگا دیں تو وہ انہیں پچاس ہزار روپے انعام کے طور پر ادا کریں گے۔ علاقے کے ناظم نے یہ بات قبول کی اور مسٹر جمیل صاحب یہاں آئے۔ مسٹر جمیل اور باقی سب پر کیا بیتی یہ تو کوئی نہیں جانتا، اور سب کو یقین تھا کہ اوروں کی طرح مسٹر جمیل بھی موت کو گلے لگائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ صبح آٹھ بجے مسٹر جمیل نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی تھی اور ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مگر وہ زندہ تھے، وہ پہلے شخص تھے جو اس گھر سے زندہ نکل آئے تھے۔ مگر موت ان کے نصیب میں لکھی جا چکی تھی، اس لیے کل ان کی بھی ڈیتھ ہو گئی۔ تو گویا اس گھر میں جو بھی رہا.... اس کا انجام صرف موت تھی.... صرف موت۔''

یہاں تک کہہ کر فراز خاموش ہو گیا اور میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''اور اب تم ساتویں شخص ہو جو اس گھر میں رہنے کے لیے آئے ہو۔ اگر تم ابھی بھی واپس جانا چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔''

فراز نے مجھے دیکھ کر مشورہ دیا اور حنا بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ایک نظر اپنی بہن اور بہنوئی کو دیکھا اور گہرا سانس لے کر جواب دیا:

''فراز میں نہیں جانتا کے اگلے کچھ گھنٹوں میں مجھ پر کیا گزرنے والی ہے.... مگر اس بات کا احساس مجھے ہے.... کہ اس گھر میں ہونے والے ہر واقعے کو کوئی روک سکتا ہے.... تو وہ بس میں ہوں.... اور میں اسے روک کر رہوں گا....''

میری یہ بات سن کر فراز نے ہاں میں سر ہلایا:

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ میرے خیال سے اب ہمیں چلنا چاہیے۔''

''ہاں اب چلتے ہیں۔ رات کے دس بج گئے ہیں دیر ہو گئی ہے کافی۔ روحیل تم دروازے سارے اچھی طرح سے بند کر لینا۔'' حنا نے مجھے دیکھ کر سمجھایا۔

”تم لوگ بے فکر رہو۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”میں برتن رکھ دوں۔“ حنا نے برتن اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں میں رکھ دوں گا۔ تم نے کافی کام کیا ہے آج بس اب مجھے سنبھالنے دو۔“ میں نے پیار سے اسے روکا اور وہ دونوں مسکرانے لگے۔

ہم تینوں مرکزی دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھول کر دونوں باہر گئے۔ میں انہیں الوداع کہنے کے لیے باہر تک آیا۔ فراز اور حنا گاڑی میں بیٹھے تو فراز نے مجھ سے کہا:

”خیال رکھنا۔“

اس کی بات سن کر میں نے ہاں میں سر ہلایا۔

”روحیل.... کھانا کچن میں رکھا ہوا ہے، بعد میں بھوک لگے تو کھا لینا....“

حنا نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”ارے میری بہنا تم پریشان مت ہو، میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”روحیل ایک بات پوچھوں؟ میں یہ پوچھنا چاہتا نہیں مگر کیا پتا.... سب سے اہم بات شاید یہی ہو جائے۔“ فراز نے دھیرے سے یہ جملے ادا کیے۔

”پوچھو فراز۔“

میری اجازت ملنے پر فراز نے مجھے جی بھر کر دیکھا اور گہرا سانس لے کر بولا:

”کوئی آخری خواہش؟“

فراز کا لہجہ سرد تھا مگر اس کی آنکھوں میں پریشانی چھلک رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ حنا کو اپنے شوہر کا یہ سوال خاصا ناگوار گزرا مگر حالات اور وقت کا تقاضا اس سوال کو بہت اہمیت دے رہا تھا۔ مجھے فراز کا یہ سوال سن کر بہت خوشی ہوئی تھی، واقعی یہ بات درست تھی، خدا نخواستہ مجھے کچھ ہو جاتا تو کم از کم میری خواہش تو پوری ہو جاتی۔ میں نے ایک نظر اپنے بہنوئی کو دیکھا اور نظریں جھکا کر صرف اتنا کہہ سکا:

”بس میری بہن کا بہت خیال رکھنا.... اور ہو سکے تو مجھے صبا اور اکمل کے برابر دفن کرنا۔“

میری بات سن کر حنا کی آنکھیں بھیگ گئی اور فراز کا دل بھی رنجیدہ ہو گیا۔ خاموشی سے اس نے سر کو ہلایا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔ حنا بھی خاموشی سے گاڑی میں بیٹھی۔ فراز نے گاڑی

اسٹارٹ کی۔ جلد ہی ان کی گاڑی چل پڑی۔ میں کافی دیر تک انہیں ہاتھ ہلا کر الوداع کہتا رہا۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے ایک نظر دائیں جانب دیکھا تو ویران سڑک نظر آئی۔ رات کا اندھیرا، خاموشی، بس ہوا کے گزرنے کا احساس اور کچھ نہیں۔ میں نے بائیں جانب دیکھا تو وہی منظر نظر آیا۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ ایک نظر اٹھا کر آسماں کی طرف دیکھا تو ستارے چمکتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے گہرا سانس لیا اور واپس گھر کے اندر چلا۔ خاموشی سے میں نے دروازہ بند کیا۔ میں 24/10 Street 12 میں تنہا تھا۔

☆......☆

Chapter 3

فراز اور حنا کو گئے ہوئے پندرہ منٹ سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔انہیں الوداع کہہ کر میں واپس گھر میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے اچھے سے لاک لگایا۔ایک بار پھر میں تنہا اپنے گھر کو تک رہا تھا۔ بہت یادیں جڑی تھیں اس گھر سے۔ کچھ ایسے پل بیتے تھے جنہیں میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا،مگر بیتے ہوئے پل اب گزر چکے تھے،میں انہیں یاد کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔اپنی بدنصیبی پر مسکرا کر میں نے ٹیبل پر رکھے ہوئے برتن اٹھائے اور کچن کی طرف چلا۔سنک میں برتن رکھے۔ برتن دھونے کے بعد میں اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا۔سیڑھیاں چلتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔جلد ہی میں اپنے کپڑے استری کر رہا تھا۔اس کے بعد میں نے باتھ روم میں جا کر دانت برش کیے اور ہاتھ منہ دھوئے۔تولیے سے منہ پوچھ کر میں باہر آیا اور اوپر والی منزل کے برآمدے کو دیکھنے لگا۔

سیڑھیوں کے پاس ٹوٹی ہوئی کھڑکی اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت تھی کہ مسٹر جمیل اس کھڑکی سے چھلانگ لگا گئے تھے۔مگر کس بات سے ڈر کر؟ ایسی کون سی بلا ان کے پیچھے لگی تھی کہ انہوں نے بیس فٹ کی بلندی سے کودنا ہی ٹھیک سمجھا؟ یہ سب سوچ کر میں صرف حیران رہ جاتا کیوں کہ اب تک گھر میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جو انسان کو اپنی جان دینے پر مجبور کر دے۔ میں گردن کو جھٹک کر اپنے کمرے میں آیا اور دیوار پر لکھے ہوئے ان الفاظ دیکھنے لگا۔نجانے یہ الفاظ کیا تھے اور ان کا کیا مطلب تھا۔سب سے بڑھ کر سوال یہ تھا کہ جملے لکھ کر کون گیا؟ کچھ سوالوں کے جواب مجھے معلوم نہیں تھے اور انہی کی تلاش میں میں اس گھر میں موجود ہوں۔

ساڑھے دس بج گئے تھے اور میرا الٹی میٹم ٹائم ختم ہونے میں اب بس ساڑھے نو گھنٹے باقی تھے۔ میں اپنے بستر کی طرف بڑھا اور آرام سے لیٹ گیا۔ جب سے کراچی آیا تھا تب سے بس ادھر ادھر بھاگے جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کر کے اپنی بیتی ہوئی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا جب صبا میری بانہوں میں ہوتی تھی اور میں اس کے جسم کو ہر جگہ سے چوما کرتا تھا۔ کس قدر سکون اور راحت ملتی تھی مجھے۔ دنیا کی ایک اور سب سے بڑی خوشی میری زندگی میں میرا دو سال کا بیٹا تھا۔ میرا گپلو سا بیٹا، جسے دیکھنے کے لیے، اسے پیار کرنے کے لیے لوگ ترستے تھے۔ جب وہ میری بانہوں میں ہوتا تھا تو مجھے ایسا لگتا جیسے ساری کائنات میری بانہوں میں ہے۔ میں اپنے بیٹے کو بہت چاہتا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب پارک میں وہ میری طرف ننھے ننھے ہاتھ آگے کر کے دوڑا آ رہا تھا تو بڑے پیار سے اس نے مجھے پاپا کہا تھا.... کاش ایک بار.... صرف ایک بار پھر سے اس کے منہ سے پاپا سن سکوں.... میں تڑپ رہا ہوں.... میں تڑپ رہا ہوں....

''پپ.... پا....''

اچانک میرے کانوں میں اکمل کی آواز آئی اور میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ میرے بیٹے نے مجھے پاپا کہہ کر پکارا تھا۔ میں نے اس کی آواز کو صاف محسوس کیا۔ گھبرا کر میں نے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی نہیں تھا۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا پڑا تھا اس لیے سیڑھیوں تک با آسانی دیکھ سکتا تھا۔ وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا تو پھر مجھے اکمل کی آواز کیسے آ گئی؟ میں حیرت زدہ سا اپنے بستر پر بیٹھا رہا۔ شاید یہ میرا وہم تھا۔ ویسے بھی فراز کی باتوں نے میرے دل پر خاصا اثر کیا تھا اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ میں وہمی ہو رہا ہوں یہ عین ممکن تھا۔

گہرا سانس لے کر میں اپنے بستر سے اٹھ بیٹھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ہولے ہولے قدم رکھ کر میں سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو سیڑھیاں ویران اور خالی نظر آئیں۔ میں نے سیڑھیوں کو تکا اور پھر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ٹوٹی ہوی کھڑکی میں سے جب ہوا کے جھونکے میرے چہرے پر پڑتے تو جسم سن سا ہونے لگتا۔ میں چلتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا اور باہر جھانکنے لگا۔ اسٹریٹ بارہ اس وقت سنسان پڑی تھی۔ آدم نہ آدم زاد۔ میں نے دائیں سے بائیں تک دیکھ ڈالا مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ نظر جھکا کر اپنے لان کو دیکھا۔ لان اوپر سے قریب قریب بیس بائیس فٹ نیچے تھا اور یہاں سے کودنا اپنی جان دینے کے برابر ہی تھا۔ مسٹر جمیل

نصیب والے تھے جو پھر اتنے دن زندہ رہ گئے۔

میں پلٹ کر سیڑھیاں اتر کر نیچے کی طرف چلا۔ نیچے کا لاؤنج سنسان پڑا تھا اور کسی کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ میں نے اپنی کلائی پر بندھی الیکٹرونک گھڑی پر نظر ڈالی تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ میں چلتا ہوا نیچے آیا اور صوفے کی طرف بڑھا۔ میں نے صوفے پر سے کشن اٹھایا اور بیٹھنے ہی لگا تھا کہ تڑپ کر گرا۔ اور خوف میری آنکھوں میں سما گیا۔

کچن میں ایک شخص موجود تھا۔

☆......☆

میرا دل نکل کر حلق میں آ گیا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس شخص کو دیکھ رہا تھا۔ گھر کے سارے دروازے بند تھے تو پھر یہ شخص اچانک کہاں سے آ گیا؟ شاید کچن کا دروازہ کھلا رہ گیا ہو۔ مگر.... مگر اسے تو میں نے اچھی طرح بند کیا تھا تو پھر یہ کس طرح گھر میں داخل ہوا؟ اس شخص نے سر پر کالا ہیٹ پہنا ہوا تھا، موٹا جسم، کریم کلر کی پینٹ، چیک والی شرٹ، جسم کا رنگ کالا اور گھنی مونچھیں۔ وہ بیجان نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ وہ مکمل خاموش تھا۔ میں کانپنے لگا۔ میں اس شخص کو خوفزدہ ہو کر دیکھنے لگا۔ ابھی بھی مجھے اس بات کا علم نہیں ہوسکا تھا میرے سامنے موجود کوئی آسیب ہے یا کوئی دہشت گرد۔ مگر وہ جو بھی تھا اس سے میری جان کو خطرہ تھا۔

اچانک وہ چلتا ہوا میری طرف آیا اور مجھے گھورنے لگا۔ اس کا اس طرح میری طرف آنا مجھے اور دہشت زدہ کر گیا اور میں وہیں بیٹھا ہوا خوف کے عالم میں اسے تکنے لگا۔

وہ چلتا ہوا کچن سے باہر آیا اور ایک دم تھم گیا۔ پھر گردن گھما کر اس نے دائیں طرف دیکھا اور پھر بائیں طرف۔ ایسا لگا جیسے وہ کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ میں خاموشی کے عالم میں اسے یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

وہ چلا اور صوفے کی طرف آیا۔ بھاری جسم کے ساتھ دھم سے صوفے پر بیٹھا۔ جیب سے موبائل فون نکالا اور کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ میں حیرت کے عالم میں اسے یہ سب کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب ایسا لگا جیسے کہ اسے احساس ہی نہ ہو کہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔

وہ دراصل مجھے گھور ہی نہیں رہا تھا، گھورنا تو دور کی بات وہ مجھے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اطمینان سے کسی کو فون کرنے میں مصروف تھا.... وہ اپنی ہی دھن میں تھا۔ جلد ہی اس نے موبائل

فون اپنے کان پر لگایا:

''ہاں.... محمد وقاص بات کر رہا ہوں....ابھی تک تو گھر میں کچھ نہیں ہوا.... نہ ہی مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا ہے.... مگر مجھے یقین ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہے رات میں ہی مجھ پر حملہ آور ہوگا۔ اس لیے میں اپنا کام شروع کرنے والا ہوں.... تم بے فکر رہو....بہت سے بھوت دیکھے ہیں میں نے....ہاں.... چلو اوکے....میں فون بند کرتا ہوں....ان شاء اللہ صبح ملاقات ہوگی....خدا حافظ۔''

یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور موبائل اپنی جیب میں رکھنے لگا۔

اب میں ہمّت کر کے آگے بڑھا: ''ایکسکیوزمی؟''

میری بات جیسے اس نے سنی ہی نہیں۔

''ہیلو؟ کون ہیں آپ؟''

میں نے حیران ہو کر پوچھا مگر وہ تب بھی نہیں بولا، بس خاموش بیٹھا رہا۔

''ہیلو؟ کیا آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے؟''

میں نے حیران ہو کر پوچھا پر وہ خاموش رہا۔

''ہیلو؟ میری بات کا جواب دیں؟ آپ.... آپ کا تو انتقال ہو گیا تھا؟ تو.... تو کیا وہ خبر جھوٹی تھی؟ پلیز جواب دیں؟''

میں اسے دیکھ کر پوچھتا رہا مگر وہ اپنے کام میں مگن رہا۔ اس نے مجھے نہیں سنا۔ ایسا لگا جیسے اسے میرے یہاں ہونے کا احساس ہی نہیں۔ اچانک وہ اٹھا اور اپنی پتلون کی جیب سے ایک چھوٹی سی کتاب اور چاک نکالا۔ چھوٹی سی کالے رنگ کی کتاب میں سرمئی رنگ کے کچھ نقشے بنے ہوئے تھے۔ کوئی زبان بھی لکھی ہوئی تھی جس کا مجھے قطعی کوئی علم نہیں۔ نجانے یہ کون سی زبان تھی جو نہ عربی جیسی لگی اور نہ ہی فارسی۔ میں حیرت کے عالم میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ محمد وقاص اب صوفوں کو دھکیلنے میں مصروف تھا۔ وہ فرش خالی کرنا چاہتا تھا۔ میں حیران ہو کر اسے یہ عمل کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

جب اس کام سے وہ فارغ ہوا تو وہ فرش پر بیٹھ کر چاک سے جلدی جلدی فرش پر کچھ عجیب سی تصویر بنانے لگا۔

میں حیران ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ یہ شخص میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، نجانے اس کا مقصد کیا تھا۔ وہ چاک سے تصویر بناتا گیا اور میں خاموشی سے اسے تکتا رہا۔ اس کے ہاتھ بہت تیزی سے کام کر رہے تھے، اسے دیکھ کر ایسا محسوس نہ ہوا کہ وہ کوئی دیوانہ ہے۔ وہ جو بھی کام کر رہا تھا بے انتہا مہارت کے ساتھ کر رہا تھا۔ قریب پانچ منٹ گزر گئے اور میں اسے تکتا رہا۔ جلد ہی اس نے اپنے بیگ سے موم بتّیاں نکالیں اور فرش پر بنی تصویر کے چاروں طرف رکھنے لگا۔ موم بتّیاں سجانے کے بعد اس نے انہیں آگ لگائی۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو میں نے دیکھا.... اس نے فرش پر ایک تصویر بنائی تھی، ایک انتہائی عجیب تصویر، ایک بے حد عجیب تصویر۔

چاک سے بنا دائرہ، اس کی عجیب سے لکیریں۔ کچھ عربی، فارسی یا کسی اور زبان میں عجیب و غریب حروف لکھے تھے۔ میں نے حیرت کے عالم میں اس نقشے پر نظر ڈالی اور پھر محمد وقاص کو دیکھا تو دھک سے رہ گیا، محمد وقاص اپنے ہاتھ کو چھری سے کاٹ رہا تھا۔ اس کا خون تیزی سے اس

چاک سے بنی تصویر پر گرا۔ میں خوفزدہ ہو کر اسے تکنے لگا۔ محمد وقاص نے سر اٹھایا اور اپنی آنکھوں کو پھیلا کر چلّانا شروع کیا:

''اے۔ زندگی اور موت کے مالک۔ ازل اور شروعات کے خالق۔ میں تجھ کو آواز دیتا ہوں۔ اس گھر میں بسے اس شیطان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد کر دے۔ اس بلا کا اختتام کر دے۔ اس گھر کی چھت میں سکون بخش دے۔''

اچانک میں نے کئی بلاہوں کے کراہنے کی آوازیں سنیں اور میری آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

''میں تجھے واسطہ دیتا ہوں ہر اس شہید کا جس کا خون ناحق طریقے سے بہایا گیا۔ میں تجھے واسطہ دیتا ہوں اس ماں کا جسے اس گھر میں بے دردی سے قتل کیا گیا۔ میں تجھے واسطہ دیتا ہوں اس بچّے کا جسے کمسن عمری میں بھیانک موت دی گئی۔ اس بلا کو ہمیشہ کے لیے یہاں سے جانا ہوگا۔ اسے جانا ہوگا!''

اچانک کان پھاڑنے دینے والی کئی چیخیں ایک ساتھ میرے کانوں میں گھسیں اور مجھے لگا جیسے میرے کان کے پردے پھٹ پڑیں گے۔ ہو نہ ہو یہ کئی چڑیلیں ایک ساتھ رو رہی تھیں، چلّا رہی تھیں اور ان کی وحشت زدہ آوازیں میں بخوبی سن سکتا تھا۔ میں خوف کے عالم میں اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر یہ منظر دیکھتا رہا۔

محمد وقاص اس لمحے زور زور سے اپنا منتر پڑھے جا رہا تھا اور کئی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ گھر میں بھونچال آ گیا۔ ہوائیں چلنے لگیں! .... چیزیں اپنی جگہ سے ہٹنے لگیں .... دروازے اور کھڑکیاں بری طرح سے کھڑکنے لگیں۔ چھت پر سے پلستر اکھڑنے لگا، فانوس، پردے، الماری میں رکھے برتن کپکپانے لگے!۔ گھر میں جیسے زلزلہ آ گیا۔

محمد وقاص نے اپنا منظر جاری رکھا:

''اے شیطان کے ماننے والے!۔ اے اس عذاب کے پجاری جو خدا نے تیرے نصیب میں لکھ دیا ہے۔ تجھے یہاں سے جانا ہوگا۔ تجھے یہاں سے جانا ہوگا۔ تجھے یہاں سے جانا ہوگا!''

محمد وقاص نے چلّا کر کہا اور اچانک جیسے سب کچھ ساکت ہو گیا۔ ایک دم سے خاموشی پھیل گئی اور ہر چیز سکون میں آ گئی۔ میں حیران ہو کر اس ویرانے کو دیکھنے لگا، ہلتے ہوئے پردے اور

فانوس اپنی اپنی جگہ پر آنے لگے، برتن کی کھنک آہستہ آہستہ رک گئی اور سب کچھ سکون میں ڈوب گیا۔ اب یہاں کسی کی چیخیں بلند نہیں ہورہی تھیں .... کسی کا ماتم نہیں ہو رہا تھا۔ صرف سکون تھا.... چاروں طرف گہرا سکون....

میں نے دہشت کے عالم میں چاروں طرف دیکھا اور پھر محمد وقاص کی طرف تو دھک سے رہ گیا۔ محمد وقاص آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خوف کے عالم میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس کا خوف بیان کررہے تھے۔ وہ میری طرف ہی تک رہا تھا۔ میں حیران ہوکر اسے دیکھنے لگا: ''کیا.... کیا آپ مجھے دیکھ سکتے ہو؟''

محمد وقاص اس بار بھی کچھ نہیں بولا بس مجھے تکتا رہا۔

''آپ.... آپ مجھے دیکھ سکتے ہیں؟''

میں نے پھر پوچھا مگر اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اچانک اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر سیدھا کیا اور میری طرف بڑھا۔ میں دھک سے رہ گیا، محمد وقاص مجھے قتل کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ محمد وقاص نے ایک دو قدم ہلکے اٹھائے اور پھر وہ کسی جانور کی طرح میری طرف لپکا۔ وہ چلّاتا ہوا میرے اوپر آیا اور میں نے کس کے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ میری جان لینا چاہتا تھا۔ میں حیرت اور خوف کے عالم میں اسے یہ عمل کرنے سے روکنے لگا۔ اس کی طاقت مجھ سے کئی گناہ زیادہ تھی اس لیے وہ باآسانی مجھ پر چھا رہا تھا۔ میں اسے روکنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ زور آزمائی میں وہ مجھے دھکّا دیتا ہوا اکمل کے دروازے پر لے آیا اور میرا سر میرے بیٹے کے کمرے کے دروازے پر زور سے لگا۔ محمد وقاص اب خنجر پر زور ڈالنے لگا، خنجر کسی بھی لمحے میرے دل کے آر پار ہونے والا تھا، یہ دیکھ کر میں نے جلدی سے اپنی لات چلائی اور محمد وقاص کے پیٹ پر ماری۔

وہ ڈکرایا اور تکلیف کے عالم میں پیچھے ہوا۔ یہی موقع میرے لیے کافی تھا اور میں نے ایک مکا اس کے منہ پر جڑ دیا۔ محمد وقاص الٹ کر گرا اور پلٹا تو اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ نجانے اسے میرے چہرے پر ایسی کیا خوفناک چیز نظر آئی کہ وہ اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ وہ کپکپا کر پیچھے ہونے لگا، جیسے کہ میں اسے کاٹ کھانے کے لیے بڑھ رہا ہوں۔ حیرت اور خوف کے عالم میں میں اسے تکنے لگا۔

محمد وقاص چلّاتا ہوا مرکزی دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ خوف کے عالم میں اس نے دروازے کے لاک کھولے اور باہر کی طرف بھاگا۔ میں ہڑبڑا کر اس کے پیچھے دوڑا اور دیکھا محمد وقاص اپنا سینہ پکڑ کر تڑپ رہا ہے۔ شاید اس کا دل بند ہو رہا تھا۔ میں سکتے کے عالم میں یہ منظر دیکھتا رہا۔ محمد وقاص کے منہ سے اب جھاگ نکل رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ دم توڑ رہا تھا۔

جلد ہی اس کا جسم ساکت ہو گیا اور اس کی روح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے جسم سے پرواز کر گئی۔ محمد وقاص میری آنکھوں کے سامنے مر چکا تھا۔

میں دہشت زدہ یہ منظر تکتا رہا۔

☆......☆

چند لمحوں تک میں اس شخص کی لاش کو تکتا رہا، یہ ایک دم سے کیا ہوا تھا؟ یہ سب کیا تھا؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بس ساکت نظروں سے اس کی پڑی ہوئی لاش کو دیکھنے لگا۔ اچانک میں چونکا اور گھبرا کر جلدی سے دروازہ بند کیا۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازے کو لاک لگایا اور پلٹ کر دروازے سے ٹیک لگا کر سکتے کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ میرا دل اب بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ایک انجانا سا خوف میرے اردگرد چھا گیا۔ کچھ سوچ کر میں کچن کی طرف بڑھا اور باورچی خانے سے نکلتا ہوا Junk-Yard کا دروازہ دیکھا تو وہ بھی بند نظر آیا۔ میں حیران رہ گیا، محمد وقاص وہ شخص تھا جو اس گھر کا پہلا Victim تھا۔ اس کی موت دل کے دورے سے ہوئی تھی مگر مجھے احساس ہو رہا تھا.... کہ قاتل.... قاتل کوئی اور نہیں.... شاید یہ گھر ہے؟ اس خیال کے آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ درودیوار تکنے لگا۔

گھبراہٹ کے عالم میں کچن کی زمیں پر بیٹھتا چلا گیا۔

میرا سانس پھولا ہوا تھا، ذہن الجھ رہا تھا۔

آج رات میں نے اس کی موت کے منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کیا اس کے پیچھے کوئی سازش تھی؟ یا یہ واقعی کوئی آسیبی چکّر ہے؟ میں حیرت کے عالم میں اٹھا اور لاؤنج کی طرف آیا۔ صوفے الٹے سیدھے پڑے تھے اور فرش پر وہ گلابی رنگ کی تصویر ابھی بھی موجود تھی۔ اس پر پڑا تازہ خون بھی موجود تھا۔

الجھن کے عالم میں میں ہر چیز دیکھنے لگا اور میری نظر بائیں جانب اکمل کے کمرے کی

طرف پڑیں۔ میں اکمل کے دروازے پر گیا اور اس کا کنڈا پکڑ کر دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ نہیں کھلا۔ میں اس دروازے کے سامنے تھا جب محمد وقاص نے مجھ پر حملہ کیا تھا مگر پھر وہ انتہائی خوف کے عالم میں مجھ سے دور ہو گیا تھا اور پھر اسے ہارٹ اٹیک ہوا۔ کیا وہ مجھے دیکھ کر خوف زدہ ہوا تھا یا پھر اس دروازے کو؟

میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ ٹک ٹک ٹک کی آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ یہ بلاشبہ گھڑی کی سویوں کی آواز تھی۔ میں نے پلٹ کر گھڑی کی طرف دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ گھڑی کی سویاں الٹی سمت میں تیزی سے گھوم رہی تھیں۔ ایسا لگا جیسے وقت رک گیا اور اب واپس پلٹ رہا ہے۔ میں نے سکتے کے عالم میں اپنی دیوار پر لگے ڈیجیٹل کلاک کو دیکھا تو یہ دیکھ کر میرا خون جم گیا کہ اب میری گھڑی پر وقت نہیں لکھا آ رہا تھا بلکہ الٹی گنتی چل رہی تھی۔

7:59:51 Left

☆......☆

رات کے بارہ بج گئے اور مجھے اس گھر میں آئے ہوئے سولہ گھنٹے ہو چکے تھے، گویا چوبیس گھنٹے پورے ہونے میں ابھی آٹھ گھنٹے کا وقت باقی تھا، اور آٹھ گھنٹوں بعد کیا ہونے والا تھا اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ گویا شیطانی رات کی شروعات ہو چکی تھی اور اب میرے پاس صرف آٹھ گھنٹے بچے تھے۔ محمد وقاص کا واقعہ میرے ساتھ ہونے والا پہلا واقعہ تھا۔ جب پہلا اس قدر خوفناک تھا تو باقی کس قدر خوفناک ہوں گے؟ یہ سوچ کر میری روح کانپ گئی اور میں نے فیصلہ کیا کہ جلد از جلد اس گھر سے نکل جانا چاہیے۔ میں گھبراہٹ کے عالم میں مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ میں جان گیا تھا کہ یہ سراسر آسیبی چکّر ہے اور مجھ میں اس قدر طاقت نہیں تھی کہ اس کا مقابلہ کر سکتا۔ فراز اور حنا صحیح کہتے تھے، مجھے اس گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے تھا مگر مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی۔ اب میں ڈرا ہوا اور سہا ہوا تھا۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور کنڈی کھول کر جلدی سے لاک کھولا اور دروازے کا ہینڈل پکڑ کر اسے کھینچنا چاہا مگر یہ کیا؟ دروازہ نہ کھلا۔

میں دہشت زدہ رہ گیا.... ایک دو بار کس کے دروازے کو کھینچا مگر وہ نہیں کھلا۔ اب میرے اوسان خطا ہو گئے، کیوں کہ دروازہ باہر سے کسی نے بند کر دیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے برف میری ریڑھ کی ہڈی پر رکھ دی ہو!۔ میں پھنس چکا تھا۔

''ہیلپ۔ہیلپ۔کوئی ہے!؟''

میں دروازے کو پیٹنے لگا۔ چلّانے لگا۔مگر کسی نے میری آواز نہیں سنی۔ ایسا لگا جیسے میرا ہی گھر مجھ پر ہنس رہا ہو، میری بزدلی پر قہقہے لگا رہا ہو۔

''میری مدد کرو۔ مجھے نکالو یہاں سے!۔فراز۔حنا!''

ان کے نام پکار کر میں زاروقطار رونے لگا، یا آیہ میں کہاں پھنس گیا۔اب میرا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ مجھے اپنے موبائل کا خیال آیا اور میں نے جلدی سے اپنی پینٹ کی جب سے موبائل فون نکالا پر یہ کیا۔موبائل تو بند پڑھا تھا۔جیسے اس کی بھی موت ہوگئی ہو۔گھبرا کر میں کچن کے دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھولنا چاہا مگر دروازہ نہیں کھل سکا، وہ بھی باہر سے لاک کر دیا گیا تھا۔

'''پپ...... پا.....''

میں تڑپ کر پلٹا۔ایک بار پھر مجھے اکمل کی آواز سنائی دی تھی۔مگر گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔پورے گھر میں خاموشی اور ویرانی پھیلی ہوی تھی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ لاؤنج کو تکنے لگا مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ میرے ہاتھوں کی رگیں پھول پچک رہی تھیں اور ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔میں بُری طرح پھنس چکا تھا، بُری طرح!

☆......☆

خاموشی اور گہرے سنّاٹے میں وقت گزر رہا تھا اور میں ساکت، بے بس اور مجبوروں کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ میرے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ دل جیسے نکل کر حلق میں آ گیا تھا۔ ذہن کسی انجانے خطرے کی طرف اشارہ کرر ہا تھا۔ میں خاموشی کے عالم میں کھڑا رہا۔ گہرا سانس لیا، کچھ پل ٹھہر کر میں نے ہمّت کی اور دوبارہ سے لاؤنج کی طرف بڑھا۔ ویرانے گھر میں میرے قدموں کی چاپ کی گونج مجھے ہی خوفزدہ کررہی تھی۔اسی کیفیت میں لاؤنج میں داخل ہوا لیکن اب یہاں محض سنّاٹے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ ایک ایک چیز کو تک رہا تھا۔

اسی گھبراہٹ کے عالم میں اوپر کی جانب چلا اور کھڑکی کے پاس پہنچا۔کھڑکی ابھی بھی ٹوٹی ہوئی تھی اور یہ اکلوتا رستہ تھا گھر سے باہر نکلنے کا۔ میں چاہتا تو کھڑکی کو پھلانگ کر نیچے چھلانگ لگا سکتا تھا، مگر میرا حال مسٹر جمیل کے حال سے مختلف نہیں ہوتا۔ اس لیے نیچے چھلانگ لگانے کے

بارے میں سوچ کر میرا دل کپکپا گیا۔

اچانک مجھے آوازیں آنے لگیں کچھ آوازیں.... جیسے کہیں پانی گر رہا ہو.... جیسے.... جیسے کوئی شاور۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو باتھ روم کا دروازہ کھلا نظر آیا اور شاور لینے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں حیرت کے عالم میں کھڑا رہا اور پانی کی آواز کو سنتا رہا۔

اچانک باتھ روم سے صبا کندھے پر تولیہ لٹکائے ہوئے باہر آئی:

''روحیل.... زرا نیچے سے اکمل کا صابن لیتے آئیں۔''

''اچھا لاتا ہوں....''

میں اپنی ہی آواز کو سن کر چونک گیا۔ میں نے دیکھا صبا واپس باتھ روم میں پلٹ گئی۔ میں حیران ہو کر یہ منظر دیکھنے لگا، دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ میری آنکھوں کے سامنے میری یادیں ہیں یا کچھ اور؟؟ دھڑکتے دل کے ساتھ میں باتھ روم کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ اس کے دروازے پر پہنچا۔ ڈرڈر کر میں نے اندر دیکھنے کی کوشش کی تو حیران رہ گیا۔ میری حسین و جمیل بیوی صبا اس وقت میرے دو سال کے بیٹے کے ساتھ موجود تھی۔ میرا پیارا سا ننھا بیٹا پانی کے ٹب میں بیٹھا ہوا نہا رہا تھا اور صبا اس سے باتیں کر رہی تھی۔

''آہا.... کیسا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی....''

صبا نے اسے دیکھ کر معصومیت سے یہ جملے کہے اور میں حیران ہو کر یہ لمحہ دیکھنے لگا۔

''میرا بچہ ماما کی جانو ہے.... ماما کی چھوٹی سی جانو....''

صبا انتہائی مامتا سے اپنے لعل سے باتیں کر رہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے، یہ وہ لمحے تھے جنہیں میں کبھی جیا کرتا تھا۔ میں آنکھوں میں آنسو لیے یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے پاس سے کوئی شخص گزرا اور میں نے اسے چونک کر دیکھا۔ جب میری نظر اس کے چہرے پر پڑی تو میں دھک سے رہ گیا، کیوں کہ وہ کوئی اور نہیں.... وہ میں ہی تھا۔

میرا وجود چلتا ہوا صبا کے پاس گیا:

''یہ لو.... تولیہ لے لو....''

شاید میں پاگل ہو گیا تھا، یا میں کوئی سپنا دیکھ رہا تھا، کیوں کہ اس لمحے میں اپنے وجود کو باتیں

کرتے ہوئے، چلتے ہوئے، پھرتے ہوئے بخوبی دیکھ رہا تھا۔ایسا لگا جیسے میں ایک روح ہوں اور اپنے جسم کو چلتے پھرتے دیکھ رہا ہوں۔میں حیران رہ گیا۔

''روحیل.... کل چل کر اکمل کو ڈاکٹر کے ہاں دکھا دیتے ہیں۔اس کا وزن نہیں بڑھ رہا ہے۔'' صبا نے فکرمند ہو کر کہا۔

''بچّے جب بڑے ہونے لگتے ہیں تو وزن گرتا ہے، اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں....'' میرے وجود نے صبا کو سمجھایا۔

''پھر بھی ڈاکٹر کو دکھا دیتے ہیں.... بچّے کی صحت کا بھی تو خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔'' صبا نے میرے وجود کو دیکھ کر کہا۔

''صبا.... تم اور اکمل ہی تو میرے لیے سب کچھ ہو.... لیکن تمھیں پتا ہی ہے کہ اس مہینے اخراجات کچھ زیادہ ہو گئے ہیں۔''

میرے وجود نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''جانتی ہوں روحیل.... آپ اس گھر کے لیے محنت کر رہے ہیں.... مگر اکمل کے لیے ہمیں کسی چیز پر Compromise نہیں کرنا چاہیے۔'' صبا نے میرے وجود کو دیکھ کر سمجھایا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ہم اپنے شہزادے کے لیے سب کچھ کریں گے!۔''

میرے وجود نے اکمل کو پیار کرنا شروع کیا اور ننھا بچّہ اپنے ماں باپ کے سنگ پانی میں کھیلنے لگا۔میرے وجود نے اکمل کو پیار کیا اور ایک بار پھر پلٹ کر چلا۔اب وہ باتھ روم سے نکل کر چلتا چلا گیا۔میں اسے دیکھتا رہ گیا۔میری ذات اس وقت میرے برابر میں سے ہی گزرتی چلی گئی اور میں کچھ نہیں کر سکا۔میں نے پلٹ کر صبا کو دیکھا تو میری بیوی کے چہرے پر ممتا ہی ممتا تھی۔ جب کہ میرا دو سال کا بیٹا پانی میں بیٹھا ہوا پلاسٹک کی بطخ کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔یہ منظر میرے دل کو چیرنے لگا، میرا دل بوجھل ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ خدا نے مجھے کیا کچھ نہیں دیا تھا۔سب ہی کچھ میرے پاس تھا، پھر کیونکر مجھ سے خدا نے سب چھین لیا! ایسا کیوں ہوا کہ میرا گھر اجڑ گیا؟ کیوں میرا معصوم بیٹا اس دنیا میں نہ رہا۔کیوں میری بیوی میرا ساتھ چھوڑ گئی؟ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔شاید میں ان باتوں کو اس لیے بھی زیادہ محسوس کر رہا تھا کیوں کہ میں نے اپنوں کو کھو دیا تھا اور میرے پاس کچھ نہیں تھا۔کچھ بھی نہیں۔

یہی کچھ سوچ کر میں اپنے وجود کے پیچھے چل پڑا، میں خاموشی سے .... ہولے ہولے قدم چلتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ میں بہت ہی آہستہ سے کمرے میں داخل ہونا چاہتا تھا، میری کوشش یہی تھی کہ میرے اندر جانے کی خبر کسی کو نہیں ہو۔ میں نے ہلکے ہلکے دروازہ کھولا اور اندر جھانکا، پر مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میری بھنویں اوپر کو چڑھیں اور اس بار میں نے دروازہ مکمل طور پر کھول دیا، مگر وہاں کوئی موجود نہیں تھا، کمرہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا میں نے چھوڑا تھا۔

میں حیران ہوا اور چونک کر پلٹا، پلٹ کر باتھ روم کی طرف بڑھا اور یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ اب وہاں نہ صبا موجود تھی نہ ہی اکمل۔ باتھ روم مکمل طور پر خالی تھا، نہانے کا ٹب جو تھوڑی دیر پہلے پانی سے بھرا ہوا تھا اب خالی تھا، ایسا لگا جیسے برسوں سے اس باتھ روم میں پانی بھی نہ پڑا ہو۔

میں حیرت زدہ رہ گیا۔ میرے اردگرد کیا ہو رہا تھا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ حیران پریشان ہو کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہو کر بوجھل قدموں سے اپنے بستر کے پاس چلتا چلا گیا اور دھم کر کے بستر پر بیٹھا۔ ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھی تو اندازہ ہوا کہ صرف سات گھنٹے کا وقت باقی رہ گیا ہے۔ میں نے الجھن کے عالم میں گردن جھٹکی اور دیواروں کی طرف دیکھا تو اچھل پڑا۔

جس دیوار پر انگریزی حروف میں کچھ جملے لکھے تھے وہاں اب ان الفاظ کے اوپر تازہ خون کی چھینٹیں پڑی تھیں۔

ایسا لگا جیسے دیوار پر لکھے ہوئے الفاظ بہ گئے ہوں۔ اب مجھ پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ انگریزی کے وہ الفاظ لال رنگ سے نہیں بلکہ انسانی خون سے لکھے گئے تھے۔ میں خوف کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ منظر دیکھنے لگا۔ انگریزی حروف میں لکھے ہوئے الفاظ ابھی بھی وہیں موجود تھے اور ان پر سے خون بہہ رہا تھا....

میں اپنے بال کھینچ کر ان حروف کو تکنے لگا۔ آخر ان منحوس الفاظ کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟، یہ الفاظ مجھ سے کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟ بلاشبہ یہ الفاظ کسی لال رنگ سے نہیں بلکہ خون سے لکھے ہوئے تھے! اس کا مطلب ان حروف کا کوئی مقصد تھا؟ میں کوشش کر کے سوچنے لگا! سوچنے لگا کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ مگر میری کچھ سمجھ نہیں آیا، شاید....شاید میں اس گھر کی حقیقت کے بارے میں سوچ سوچ کر پاگل ہونے لگا تھا۔

تازہ خون دیکھ کر مجھے وحشت ہونے لگی اس لیے میں کمرے سے بھاگ کھڑا ہوا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔جلدی جلدی سیڑھیاں اتر ہی رہا تھا کہ میری نظر لاؤنج پر پڑی اور میں ایک جھٹکے سے رکا۔ایک بار پھر میں دھک سے رہ گیا۔میں نے صاف دیکھا،لاؤنج کے صوفے پر ایک شخص نہایت ہی اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

☆......☆

Chapter 4

وہ شخص کالی پتلون، کالا کوٹ اور سفید قمیص پہنے ہوئے تھا۔ ہونٹوں میں سگریٹ موجود تھی اور دھویں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ عمر اٹھائیس تیس سال کے قریب تھی، بلاشبہ وہ ایک خوبصورت اور پڑھا لکھا نوجوان تھا۔

''کون؟''

میرے پوچھنے پر اس نے چونک کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا اور حیران ہو کر بولا:

''کون ہو تم؟ اور اس گھر میں کیسے داخل ہوئے؟''

''یہی میں آپ سے پوچھ رہا ہوں، کون ہیں آپ اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

میں نے بھی سوال کیا۔

''میرا نام ڈاکٹر عدیل انصاری ہے، میں ایک سائیکی ٹرسٹ ہوں۔''

اس نے اپنا تعارف کرایا اور میں دھک سے رہ گیا۔ اس گھر میں مرنے والا ایک اور شخص میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیا یہ شخص زندہ ہے یا مردہ۔ کیا میرے سامنے محض ایک روح کی شکل میں موجود تھا؟ یا ڈاکٹر عدیل زندہ سلامت میری آنکھوں کے سامنے موجود ہے؟ میں سکتے کے عالم میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔

دوسری طرف ڈاکٹر عدیل مجھے دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ ایسا لگا جیسے آسیب وہ نہیں میں خود ہوں۔ گھبراہٹ کے عالم میں وہ مجھے تکتا رہا۔ میں سیڑھیاں اترا اور اس کی طرف بڑھا۔ ڈاکٹر عدیل مجھے اس طرح آتے ہوئے دیکھ کر مزید گھبرا سا گیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہوا۔

میں اسے تکتے ہوئے اطمینان سے مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولنا چاہا تو دروازہ کھٹ سے کھل گیا۔ میں حیران رہ گیا، باہر جانے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر لان پر ڈالی تو مجھے محمد وقاص کی لاش کہیں نظر نہ آئی۔

کیا میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں؟ جس گھر میں اس وقت میں موجود ہوں وہاں آسیب نہیں؟ کیا یہ سب کچھ محض ایک خواب ہے؟

الجھن کے عالم میں میں نے دروازہ بند کیا اور گہرا سانس لیا۔ پلٹ کر اس شخص کا چہرہ دیکھا جو بدستور میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''کیا تمھیں باہر کوئی لاش نظر نہیں آئی؟''میں نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''لاش؟ کس کی لاش؟''ڈاکٹر عدیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

''محمد وقاص صاحب کی لاش۔ وہ ابھی ابھی باہر لان میں دم توڑ گئے تھے۔''

میں نے اسے دیکھ کر بتایا۔

''یہ واقعہ تو قریب قریب ایک ہفتہ پرانا ہے۔ یہی جاننے کے لیے تو میں اس گھر میں موجود ہوں۔''ڈاکٹر عدیل نے حیران ہو کر بتایا۔

''بکواس مت کرو....، یہاں کیا ہو رہا ہے یہ جاننے کے لیے میں یہاں موجود ہوں، تم نہیں۔ میں اس گھر کا مالک ہوں، میرا نام روحیل ہے اور میرے جیتے جی اس گھر پر کوئی قبضہ نہیں کر سکتا۔ تم تو ویسے بھی مر چکے ہو۔''

میں نے غصیلے لہجے میں یہ جملے کہے اور ڈاکٹر عدیل مجھے دیکھنے لگا۔ اچانک اس کے لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ آ گئی: ''میں سمجھ گیا، تم میرے ہی مریض ہو۔''

''کیا مطلب؟''میں نے چونک کر پوچھا۔

''دیکھو میں ایک سائیکی ٹرسٹ ہوں، تمھاری سائیکالوجی سمجھ سکتا ہوں۔ تم اطمینان سے میرے پاس بیٹھو....''وہ ہاتھ بڑھا کر بولا۔

''خبردار! جو میرے پاس آنے کی کوشش کی!''

میں ڈر کر پیچھے ہوا اور ڈاکٹر عدیل ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گیا۔

''میں جانتا ہوں .... میں جانتا ہوں تم زندہ نہیں ہو .... تم مر چکے ہو .... تم مر چکے

ہو!!.....''میں کہتا چلا گیا۔

''اگر میں مر چکا ہوں توتم سے باتیں کیسے کررہا ہوں؟''

ڈاکٹر عدیل نے اطمینان سے پوچھا۔

''تم اس گھر میں بسنے والے ایک آسیب ہو،تم ڈاکٹر عدیل کی ایک روح ہو جواس گھر کی غلام ہے....''میں نے جلدی جلدی کہا۔

''اس گھر میں غلام ہے؟ لیکن یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''اس نے ادھرادھر دیکھ کر کہا۔

''میں تمھاری بات کررہا ہوں۔''میں جھنجلا کر بولا۔

''کون میں؟ میرا نام تو عدیل ہے؟''وہ حیران ہوکر بولا۔

''تم غلام ہو۔''میں نے اکتا کر کہا۔

''غلام انصاری میں نہیں میرا کزن ہے اور وہ امریکا میں کلینک کھولے بیٹھا ہے، میرا نام تو عدیل ہے۔شاید آپ مجھے غلام انصاری سمجھ بیٹھے ہیں۔''وہ خوش ہوکر بولا۔

''تم کیا پاگل ہو؟''میں نے غصے میں آکر پوچھا۔

''آدھے سے زیادہ سائیکی ٹرسٹ ہوجاتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں۔''

عدیل نے برابر مسکرا کر جواب دیا۔

اس کے لگاتار جوابات سے اکتاہٹ ہونے لگی۔میں نے دانت پیس کر کہا:

''میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش مت کرو، میں جانتا ہوں تم ایک بدروح ہواور کچھ نہیں....''

''بد..... کیا؟''وہ حیران ہوکر بولا۔

''بدروح....اہم....A Bad Spirit"۔میں نے اسے سمجھایا۔

"You mean I am a spirit"۔وہ حیران ہوکر بولا۔

"Exactly that's what you are"

میں نے بھی جل کر جواب دیا اور وہ ہنسنے لگا:''مسٹر روحیل، کیا آپ کو واقعی ایسا لگتا ہے کہ روحیں اور جنّات ایسے سوٹ اور بوٹ پہنتے ہیں؟''

یہ کہہ کر اس نے کپڑے دکھائے اور میں اسے تکنے لگا۔

''آپ کو آرام کی ضرورت ہے، میری مانیں یہاں صوفے پر بیٹھ جائیں، پھر ہم تفصیل سے بات کریں گے.... آپ کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں....''

اس نے مسکرا کر با اخلاق ہو کر یہ جملے کہے اور میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ واقعی کوئی سائیکیٹرسٹ تھا، میری نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا، میں اس وقت طیش میں تھا جب کہ وہ مستقل اطمینان سے مجھ سے باتیں کر رہا تھا، اس کی شوخی اور پاگل پن سے میرا اکیلا پن مٹ رہا تھا۔ میں حیران ہو کر اس کو دیکھنے لگا۔ اس کے لہجے سے مجھے گھبراہٹ گھٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور ہمّت کر کے آگے بڑھا۔ وہ اطمینان سے اپنی جگہ کھڑا رہا اور مسکرا کر مجھے دیکھتا رہا۔ میں چلتا ہوا صوفے کے پاس پہنچا اور صوفے کا سرا پکڑ کر دھم سے اس پر گرا۔ اب میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ویل.... یہ بہت اچھا ہوا کہ ہم دوستانہ ماحول میں کچھ باتیں کر سکیں۔''

ڈاکٹر عدیل نے خوش ہو کر یہ جملے کہے اور اپنا کوٹ اتار کر صوفے پر ڈالا۔ میں اس لمحے خاموشی سے اسے تکتا رہا۔

''اب کہیے.... کون ہیں آپ اور یہ سب کیا ماجرا ہے؟''

اس کے سوال پوچھنے پر میں اسے دیکھتا رہا۔

''میں نے سنا ہے یہاں پر محمد وقاص کے حادثے سے پہلے بھی ایک حادثہ ہو چکا ہے۔ ایک عورت کا قتل ہوا ہے، ایک بچّے کو ظالمانہ طریقے سے مارا گیا ہے۔ غالباً آپ اس عورت کے شوہر ہیں۔'' ڈاکٹر عدیل نے دھیمے لہجے میں پوچھا اور میں نے ہاں میں سر ہلایا۔

''کیا ہوا تھا؟'' اس نے تجسس کے ساتھ پوچھا اور میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔

''اتنی بھیانک موت انہیں نصیب ہوگی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، معصوم سا بچّہ.... دو سال کا چھوٹا سا بچّہ.... معصوم سے قدم اٹھا کر جب وہ تمھاری باہوں میں آتا ہوگا.... تو جیسے تمھیں ساری زندگی مل جاتی ہوگی۔''

ڈاکٹر عدیل سرد لہجے میں کہتا گیا۔ وہ مستقل مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں فرش کو تکنے لگا، میری آنکھوں میں آنسو نمودار ہو گئے۔

''تمھاری بیوی.... حسین و جمیل بیوی.... ایک ایسی عورت جسے حاصل کر کے تم نے چھوٹی

سی جنّت حاصل کر لی.... اس کا دل بھی بہت معصوم ہوگا.... رحم سے بھرا دل.... پیار سے بھرا دل.... اپنے بچّے اور اپنے شوہر کی محبت سے بھرا دل.... وہ بہت پیاری بیوی تھی نا؟''

ڈاکٹر عدیل نے نرم لہجے میں پوچھا اور میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

''نجانے کون دشمن ہوگیا ان کی جانوں کا.... اور اس قدر ظالمانہ طریقے سے مارا.... ایسا تو کوئی بھیڑیا اپنے شکار کے ساتھ بھی نہیں کرتا.... تمھیں پتا ہے تمھاری بیوی کو ٹکڑوں میں کاٹا گیا.... تمھارے ہی کمرے میں.... کسی نے اس کے جسم کی بوٹی بوٹی الگ کر دی.... جب اس کے ہاتھ کٹے ہوں گے تو وہ زندہ تھی.... جب اس کا پیر کاٹا گیا ہوگا.... اس وقت بھی وہ زندہ تھی.... اپنے ہی خون میں لت پت.... جن اعضاء کو تم چوما کرتے تھے.... وہ سارے حصے ایک ایک کر کے کٹ رہے تھے.... اور تمھاری ایک بیوی.... دس حصوں میں تبدیل ہوگئی....''

ڈاکٹر عدیل سرد لہجے میں کہتا رہا اور میری روح کانپتی چلی گئی۔ میرے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ میں جب کبھی وہ منظر یاد کرتا تو میری طبیعت ناساز گار ہو جاتی، اور ابھی بھی یہی ہو رہا تھا۔ میں نے سنا وہ سرد لہجے میں کہہ رہا تھا:

''اور پھر تمھارا بچّہ.... تمھارا معصوم سا بچّہ.... اس نے تو دنیا تک صحیح سے نہیں دیکھی تھی.... معصوم سا بچّہ کسی کا کیا بگاڑ سکتا تھا.... مگر کوئی وحشی تھا.... کوئی تھا جس نے اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو چھرے سے کاٹا.... اس کی ٹانگوں کو کاٹا.... اس کے ننھے سے گلے پر کلھاڑی مار دی.... کتنی نرم ہوں گی اس کی رگیں.... جب وہ کٹی ہوں گی.... تو کس قدر تازہ خون بہا ہوگا....''

''پلیز!.... پلیز!.... بس کر دو!!....''

کپکپاتے لبوں سے میں نے اسے خاموش ہونے کے لیے کہا!.... اس وقت میں بری طرح سہم گیا تھا۔ گھبراہٹ سے میرا دل بند ہو رہا تھا۔

''شش.... رو نہیں.... رونے کے لیے تو ساری زندگی پڑی ہے.... مگر آج کی رات.... آج کی رات ہم نے سچ کا فیصلہ کرنا ہے.... تمھاری بیوی اور بچّے کے قاتلوں کو ڈھونڈنا ہے.... کوئی ہے جس نے انہیں قتل کیا ہے.... کوئی تو شخص ہے.... جو آج بھی زندہ ہے.... جو آج بھی سانسیں لے رہا ہے.... جو آج بھی اس بوجھ کو دل میں اٹھائے پھر رہا ہے کہ اس نے دو معصوموں کا قتل کیا.... کیا تم نہیں چاہتے کہ اسے سزا ملے؟ اسے اپنے کیے کی سخت سزا ملے؟''

ڈاکٹر عدیل نے بدستور مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا اور میں روتے ہوئے کہنے لگا:

''جس چیز نے میرے گھر کو کھایا ہے.... تم اسے سزا نہیں دے سکتے.... میری بیوی اور میرے بچّے کے ساتھ جو ہوا وہ انسانی عمل نہیں تھا.... میرے گھر پر شیطان کا قبضہ ہے.... اس گھر میں شیطان بستا ہے.... تم اور میں اسے روک نہیں سکتے.... کوئی نہیں روک سکتا....''

''شیطان؟''

ڈاکٹر عدیل نے مسکرا کر یہ جملے کہے اور ہنسنے لگا، سر کو نفی میں ہلا کر مجھے دیکھا:

''ایک دن سے تو میں اس گھر میں موجود ہوں، مجھے تو کوئی شیطان نظر نہیں آیا؟''

اس کی بات سن کر میں چونکا:

''تم ایک دن سے کیسے یہاں ہو سکتے ہو؟ میں آج صبح اس گھر میں آیا ہوں اور میں نے اس گھر کی صفائی کی ہے۔ تم یہاں کہیں موجود نہیں تھے، تم یہاں موجود نہیں تھے جب محمد وقاص کی موت ہوئی، تم یہاں موجود نہیں تھے جب اس گھر میں جنّاتی آوازیں گونج رہی تھیں، تم یہاں موجود نہیں تھے جب میرا کمرہ خون میں لت پت ہو گیا۔ تم موجود ہو بھی کیسے سکتے ہو؟ تم تو خود ایک مردہ ہو!۔''

میں دانت پیس کر کہتا چلا گیا۔

ڈاکٹر عدیل اپنی آنکھوں کو مل کر کہنے لگا:

''مسٹر روحیل مجھے لگتا ہے کہ آپ کو اس سارے حادثے کا شدید صدمہ پہنچا ہے.... آپ ایک نفسیاتی مریض ہو چکے ہیں.... اور آپ کو مجھ جیسے قابل ڈاکٹر کی ہی ضرورت ہے.... میں آپ کو ٹھیک کر سکتا ہوں....''

''مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں، تم مجھے پاگل بنانے کی کوشش مت کرو۔ میں سب جانتا ہوں کہ یہ کیا ماجرا ہے، جب تک تم میرے سوالوں کے جواب نہیں دو گے میں تمھیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑنے والا۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''اجی آپ اپنے سوالوں کو چھوڑیں.... اور چلیں زرا میرے کچھ مزیدار سوالوں کے جواب دیں.... مسٹر روحیل.... ہر کلی پھول بن جاتی ہے پر ایک کلی نہیں بنتی۔ بتا سکتے ہو وہ کون سی کلی ہے؟'' ڈاکٹر عدیل نے مزے سے پوچھا اور میں نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا:

''کیا مطلب؟''

''ہر کلی پھول بن جاتی ہے پر ایک کلی نہیں بنتی، وہ کون سی کلی ہے جو پھول نہیں بنتی؟''

اس نے سوال دوہرایا۔

''یہاں کلی اور پھول کا کیا تعلق؟'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

''ارے!.... کلی کا پھول سے کوئی تعلق نہیں؟'' اس نے بھی حیران ہوکر پوچھا۔

''نہیں میرا مطلب.... یہاں اس گھر میں کلی کی بات کہاں سے آ گئی؟''

میں نے الجھ کر پوچھا۔

''بہت گہری بات ہے، آپ جواب دیں پہلے....'' ڈاکٹر عدیل نے اطمینان سے کہا۔

''میرے.... میرے خیال.... اہمم....'' میں سوچنے لگا۔

''میں بتاتا ہوں، وہ کلی ہے چھپکلی۔''

وہ مسکرا کر بولا اور میں حیران ہوکر اس شخص کی شکل دیکھنے لگا۔ اس قدر پرہول ماحول میں یہ شخص مستقل بکواس کر رہا تھا، اور چہرے پر دلچسپ مسکراہٹ تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس کی یہ مسکراہٹ دیکھ کر لوگ اسے محفل کی جان سمجھنے لگتے، مگر اس ماحول میں یہ مسکراہٹ بہت سنسنی خیز لگی۔ میں حیران ہوکر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''تمھارا لیفٹ برین بہت کم کام کر رہا ہے، اس لیے تم بہک رہے ہو، یہی وجہ ہے کہ ایک سمپل سے پہیلی کا جواب نہیں بتا سکے۔''

اس نے مسکرا کر یہ جملے کہے اور میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔

''اچھا، تم کو سب سے زیادہ کیا پسند ہے؟ فلمیں؟ اسپورٹس؟ ڈرامے؟''

اس نے مجھ سے ایسے پوچھا جیسے میرا کسی مارننگ شو میں انٹرویو ہو رہا ہو۔

''کیا یہ سوال میرے علاج کا حصہ ہے؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بالکل، اگر تم جواب دیتے چلے رہو تو ہوسکتا ہے کہ ہم دونوں کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔''

ڈاکٹر عدیل نے خوش ہوکر یہ جملے کہے اور میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔

گہرا سانس لے کر میں نے کہا:

''اوکے۔ مجھے کرکٹ بہت پسند ہے۔''

''کرکٹ.... کول، کھیلتے ہو؟'' اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

''ہاں کھیلا کرتا تھا.... کالج میں کھیلتا تھا۔ لیکن زیادہ تر مجھے کرکٹ دیکھنے کی حد تک پسند ہے۔ میں دیوانہ ہو جاتا ہوں جب کبھی کرکٹ میچ آتا ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''کون سا میچ تمھارا پسندیدہ ہے؟'' ڈاکٹر عدیل نے پوچھا اور میں سوچ کر کہنے لگا:

''ویسے تو کافی سارے ہیں، پاکستان کے سارے میچ اچھے لگتے ہیں۔ مگر میرا پسندیدہ میچ ہے ہندوستان بامقابلہ پاکستان کا، وہ میچ جس میں ہم نے ہندوستان کو ہرا کر چیمپینز ٹرافی جیتی تھی۔''

''ہمم.... اور کوئی میچ؟'' ڈاکٹر عدیل نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''اور.... اور 1992 .... ورلڈ کپ فائنل۔ میں بہت چھوٹا تھا جب وہ فائنل ہوا تھا۔ جب بڑا ہوا تو پورا میچ یوٹیوب پر دیکھا۔ مجھے آج بھی وہ میچ اچھی طرح رٹا ہوا ہے.... ورلڈ کپ جیتا تھا ہم نے۔'' میں نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

''واہ.... پاکستان نے ورلڈ کپ جیتا تھا، واقعی وہ میچ بہت زبردست تھا۔ تمھارے خیال سے کس کی وجہ سے ہم نے میچ جیتا؟'' ڈاکٹر عدیل نے مسکرا کر پوچھا۔

''سب ہی کی وجہ سے، پورا ٹیم ایفرٹ تھا۔ مگر میرے خیال سے عمران خان اور جاوید میانداد کی پارٹنر شپ نے میچ کا پانسہ پلٹ دیا تھا۔'' میں نے اسے دیکھ کر کہا۔

''ہاں اس کے بعد انضمام اور وسیم اکرم کی دھواں دھار بیٹنگ نے ہمارا اسکور 249 کر دیا تھا۔'' ڈاکٹر عدیل نے مسکرا کر کہا۔

''اور پھر وسیم اکرم کی تین وکٹس۔'' میں نے بھی مزے لیتے ہوئے کہا۔

''تین نہیں دو وکٹ۔'' ڈاکٹر عدیل نے اطمینان سے کہا۔

''دو نہیں تین۔ مجھے یاد ہے وسیم اکرم نے ایک ساتھ تین وکٹیں لی تھیں۔'' میں نے اسے صحیح کیا۔

''تین نہیں دو لی تھیں۔''

اس نے اطمینان سے اپنی بات دوہرائی اور میں جھنجلا کر بولا:

''ارے یار پہلا تو ایلن لیمب آوٹ ہوا تھا۔''

''ہاں اور دوسرا؟'' اس نے پوچھا۔

''کرس لویس نام تھا شاید۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''او کے اور تیسرا؟'' اس نے پوچھا۔

''اہمم.... وہ.... یاد نہیں۔'' میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''یا داس لیے نہیں کیوں کہ اس نے دو وکٹیں لی تھیں۔'' ڈاکٹر عدیل نے پھر کہا۔

''دو نہیں تین لیں تھیں۔ تین وکٹیں۔'' میں نے اکتا کر کہا۔

''تو کون ہے وہ تیسرا؟''

ڈاکٹر عدیل نے الجھ کر پوچھا اور میں سوچنے لگا۔ میں اپنے ذہن پر بری طرح زور ڈال رہا تھا، نجانے کیوں میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور خون بھی رگوں میں تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اگر میں نے تیسرے کھلاڑی کا نام یاد نہ کیا تو کوئی جنگ ہار دوں گا۔ مجھے ہر حال میں وہ نام یاد کرنا تھا۔

ڈاکٹر عدیل نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولا:

''تمھاری یادداشت کمزور ہے روحیل، وسیم اکرم نے دو وکٹیں....''

''این بوتھم!!....''

میں ایک دم سے بولا اور پھر جوش میں آ کر کہا:

''این بوتھم کی وکٹ لی تھی۔ وسیم اکرم نے ایک ساتھ تین وکٹیں لی تھیں۔''

''دو لی تھیں۔'' ڈاکٹر عدیل نے پھر اطمینان سے کہا۔

''ارے۔۔ میں تمھیں گنوا رہا ہوں اور تم ہو کہ دو دو کی رٹ لگائے ہوئے ہو!'' میں نے غصے میں آ کر کہا۔

''ہاں، کیوں کہ وسیم اکرم نے دو وکٹیں ایک ساتھ لی تھیں۔ پہلی وکٹ این بوتھم کی پہلے اوور میں ہی لے لی تھی۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔'' میں حیران ہو کر بولا۔

''تم کہہ رہے تھے کہ ایک ساتھ تین لیں۔ جب کہ ایک ساتھ وسیم اکرم نے دو لی تھیں۔'' ڈاکٹر عدیل نے مسکرا کر کہا۔

میرا خون جل گیا۔ میں نے دانت پیس کر کہا:
''میں یہاں ہیٹ ٹرک کی بات نہیں کر رہا تھا۔''
''لیکن میں تو ہیٹ ٹرک کی ہی بات کر رہا تھا۔ تم بھول گئے کیا؟''
اس نے حیران ہو کر کہا اور میں الجھن میں پڑ گیا۔
''رائیٹ برین بھی کام کرنا بند کر رہا ہے، یاداشت کمزور ہو رہی ہے اور بات بات پر طیش آ رہا ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔
'' بکواس بند کرو۔'' میں نے جل کر کہا۔
''اچھا یہ بتاؤ یہ کتنی انگلیاں ہیں؟''
ڈاکٹر عدیل نے میری بات کو درگزر کر کے ایک دم سے مجھ سے یہ سوال کیا اور اپنے دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں دکھائیں۔
''چار....'' میں نے ایک دم سے جواب دے دیا۔
''مسٹر روحیل، میں نے پانچ انگلیاں کھولی ہیں۔'' ڈاکٹر عدیل نے مسکرا کر بتایا اور میں نے دیکھا تو اس بار اس کے ہاتھ کی پانچ انگلیاں کھلی تھیں۔
''آپ نفسیاتی مریض بن چکے ہیں۔'' وہ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔
"Is this some kind of a sick joke"۔ میں تلملا گیا اور صوفے سے اٹھا۔
''آپ اطمینان سے بیٹھیں۔'' وہ پیار سے بولا۔
''بھاڑ میں گیا اطمینان۔۔ تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو۔''
میں نے اس کی طرف انگلی کر کے کہا۔
''میں صرف آپ کی مدد کر رہا ہوں مسٹر روحیل۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔
''دیکھو میں کوئی پاگل واگل نہیں ہوں، میری بات کا سب سے بڑا ثبوت ہی یہی ہے کہ یہاں اب سے کچھ دیر پہلے محمد وقاص کی لاش موجود تھی۔'' میں نے مرکزی دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
''اور اب وہ لاش کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا اور میں گڑبڑا گیا مگر ایک دم سے بولا:
''اور فرش پر اس نے ایک نقشہ بنایا تھا۔''

’’نقشہ؟‘‘ ڈاکٹر عدیل چونکا۔

’’ہاں ....وہ یہیں تھا....‘‘

میں نے تڑپ کر یہ جملے کہے اور جلدی جلدی صوفے ہٹانے لگا۔مگر یہ کیا؟ اب فرش پر کسی قسم کی کوئی نقشہ موجود نہیں تھا۔ میں سکتے میں آ گیا، میری ایک ایک بات غلط ثابت ہو رہی تھی اور میں حیران تھا۔

’’کیا ہوا مسٹر روحیل؟‘‘

ڈاکٹر عدیل نے الجھ کر پوچھا اور میں خاموش رہا، کہنے کے لیے تھا بھی کیا میرے پاس۔ ڈاکٹر عدیل نے ایک سرد آہ لی اور میرے پاس آیا:

’’مسٹر روحیل، میں آپ کے غم کو سمجھ سکتا ہوں.... پلیز آپ اپنے ذہن پر زور مت دیں.... ان شاءاللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے‘۔

اس نے پیار بھرے لہجے میں یہ جملے کہے اور میں گڑ بڑا گیا۔ دو پل کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے کہ شاید میں پاگل ہو گیا ہوں،، فراز اور حنا کے ساتھ میرا یہاں آنا محض میرا ایک خیال تھا، حقیقت تو کچھ اور تھی۔شاید میں نفسیاتی مریض ہو گیا ہوں۔

’’مسٹر روحیل آپ اطمینان سے میری بات سنیں، اور یہاں بیٹھیں۔‘‘ اس نے میرے شانوں کو پکڑ کر مجھے صوفے پر بٹھایا۔ میں ایک بار پھر صوفے پر دھم سے گرا۔

’’ٹھہریں میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں....‘‘

یہ کہہ کر وہ کچن میں گیا۔ میں پریشانی کے عالم میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ میرے اوپر کیا گزر رہی ہے، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں یا یہ کوئی اور اندھی حقیقت ہے؟ جلد ہی عدیل میرے لیے گلاس میں پانی لایا۔

’’یہ لیجیے....‘‘

اس نے مجھے بڑے ہی اخلاق سے گلاس دیا اور میں نے اسے ایک نظر دیکھ کر گلاس لیا اور لبوں سے لگایا مگر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔گلاس میں پانی موجود نہیں تھا۔

’’پانی کہاں ہے؟‘‘میں نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

’’ابھی ابھی تو آپ نے پیا ہے۔‘‘اس نے جواب دیا۔

”تم نے مجھے گلاس خالی لا کر دیا ہے!“ میں نے تیز آواز میں کہا۔
”مسٹر روحیل آپ نے میرے سامنے پانی پیا ہے، اگر آپ کو پھر پانی پینا ہے تو لا دوں پانی؟“اس نے پیار سے پوچھا۔

"You listen to me"

میں نے دانت پیس کر یہ جملے کہے اور اٹھ کر گلاس فرش پر پھینکا۔ گلاس چھناّ کے سے ٹوٹا۔ عدیل اب مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔

"I don't know what you're upto and what you're trying to show, but I can't take this "fucking shit anymore"۔

میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

۔"Mr.Rohail I'm just trying to help you"

عدیل نے اطمینان سے کہا۔

"Fuck You"

میں نے دانت پیس کر اسے گالی دی اور وہ میرا چہرہ تکنے لگا، اب میں بھی اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔عدیل نے مجھے کچھ پل دیکھا اور پھر گہرا سانس لے کر بولا:

۔"Alright"

عدیل نے مسکرا کر یہ جملے کہے اور اطمینان سے صوفے پر بیٹھا۔
میں اس کی حرکات کو تکتا رہا۔
وہ اطمینان سے بیٹھا اور مجھے دیکھ کر کہنے لگا:
”ٹھیک ہے، میں آپ کی بات مان لیتا ہوں، میں نے آپ کو گلاس میں پانی لا کر نہیں دیا، میں یہاں ایک دن سے موجود بھی نہیں ہوں اور نہ ہی میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں آخر چاہتا کیا ہوں؟ کیا آپ کو لگتا ہے کہ میرے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ میں یہاں صوفے پر بیٹھ کر آپ سے مغز ماری کروں؟“
میں خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔
”اپنے آپ کو سنبھالیے مسٹر روحیل۔اس سے پہلے کے بہت دیر ہو جائے۔اس گھر میں کچھ خراب نہیں ہے، اگر کچھ خراب ہے۔۔تو وہ بس ہے آپ کا دماغ۔آپ ایک نفسیاتی مریض ہیں

اور آپ کو میرے اسپتال کی بہت ضرورت ہے۔'' اس نے مجھے سمجھایا اور میں سوچنے لگا۔

''مجھ پر یقین رکھیے، میں آپ کو ٹھیک کر سکتا ہوں۔ ٹرسٹ می۔''

اس نے انتہائی اطمینان کے ساتھ یہ سب باتیں کہیں اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا سچ تھا اور کیا جھوٹ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ شخص ایک ہی پل میں مجھے حد سے زیادہ خطرناک لگتا اور دوسرے ہی پل مجھے معصوم اور میرا مددگار لگنے لگتا۔ میں الجھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کروں۔

میں نے ڈاکٹر عدیل کی طرف دیکھا:

''آئی ایم سوری ڈاکٹر.... آئی ایم سوری.... میں نے آپ سے بدتمیزی کی.... مگر.... مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا.... میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے....''

میرے جملے سن کر عدیل مجھے تکتا رہا۔

''میرا گھر ختم ہو گیا.... میری اولاد اس دنیا سے چلی گئی.... ایک ہی پل میں.... میرا سب کچھ مجھ سے چھن گیا.... میں یہاں سے چلا گیا.... اس وجہ سے.... کہ ان کی یادوں سے دور ہو سکوں.... مگر.... دور ہو کر بھی.... ہر رات.... ہر دن.... میں اپنی بیوی.... اور بچّے کو یاد کرتا چلا گیا.... میں پاگل ہو جاؤں گا ڈاکٹر.... شاید.... شاید میں پاگل ہو جاؤں گا....''

میں روتے ہوئے کہتا گیا اور عدیل صوفے پر سے تھوڑا آگے ہوا:

''مسٹر روحیل.... ہمّت رکھیے.... سب ٹھیک ہو جائے گا.... میں اور آپ.... مل کر آپ کے خوف کا خاتمہ کریں گے.... اور اس گھر کو بھی پاک کر دیں گے.... سب کچھ نارمل ہو جائے گا۔''

اس کے جملے سن کر میں ایک دم چونکا، گھر کو پاک کر دینے سے مجھے دیواروں پر خون سے لکھے ہوئے وہ حروف یاد آ گئے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا:

''ڈاکٹر میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔''

''کیا؟ وہ مجھے دیکھ کر بولا۔

''کچھ الفاظ۔ جو میرے کمرے کی دیواروں پر لکھے ہیں، شاید انہیں دیکھ کر آپ کو میری بات کا یقین آ جائے۔''

میں نے جلدی جلدی یہ جملے کہے اور اوپر کی منزل کی طرف چلا۔ ڈاکٹر عدیل بھی میرے

ساتھ چل پڑا۔

''آیئے ڈاکٹر......آیئے....''

میں نے اوپر جاتے ہوئے یہ جملے کہے اور سیڑھیاں چڑھ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ڈاکٹر عدیل بھی میرے پیچھے پیچھے آتا رہا۔ہم تیز تیز قدم اٹھاتے کمرے کی طرف بڑھے۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اس قدر زور سے اچھلا کہ کیا کبھی اچھلا ہوں گا۔

کمرے کا اس قدر وحشت زدہ منظر دیکھنے کی مجھے بالکل امید نہیں تھی۔کمرے کی دیواریں خون میں تر تھیں اور ہر دیوار پر انگریزی حروف کے وہی الفاظ لکھے ہوئے تھے۔تازے خون کی بدبو اس لیے بھی اٹھ رہی تھی کیوں کہ کمرے کی دیوار کے ساتھ صبا کی کٹی پٹی لاش پڑی تھی۔ اس کا کسی نے ابھی ابھی خون کیا تھا۔

☆......☆

چند لمحوں تک ہم دونوں یہ منظر دیکھتے رہے، خوف سے ہم دونوں کی آنکھیں پھٹی پڑی تھیں۔ میرے ہوش اڑ گئے تھے، جس منظر کو سوچنے سے ہی میرا دل گھبراتا تھا وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ ڈاکٹر عدیل آگے بڑھا اور کٹے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھنے لگا۔ اس لمحے میں سکتے کے عالم میں یہ منظر تک رہا تھا۔

''کیا کیا تم نے اس کے ساتھ؟''

ڈاکٹر عدیل جیسے خوابوں میں بولا اور میں بُری طرح چونکا۔

''بولو کیا کیا تم نے اس کے ساتھ؟'' ڈاکٹر عدیل پلٹ کر چلّایا۔

''میں نے؟ میں نے کیا، یہ سب؟'' میں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

''ہاں! ہاں!.... تم نے کیا ہے یہ سب۔ تم ہی تھے جو دوسری منزل پر موجود تھے۔ تم نے ایک معصوم عورت کا خون کر ڈالا!'' وہ چلّایا!

''بکواس بند کرو ڈاکٹر!'' میں بھی طیش میں آکر چلّایا۔

''تم ایک پاگل شخص ہو۔ تمھارا زندہ رہنا لوگوں کے لیے خطرہ ہے۔''

ڈاکٹر عدیل نے دانت پیس کر یہ جملے کہے اور تب ہی اس نے کمر کے پاس سے ایک بڑا خنجر نکالا۔ میں خنجر دیکھ کر دھک سے رہ گیا، یہ بالکل ویسا ہی خنجر تھا جیسا وقاص کے پاس تھا۔

''مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ روحیل....''

یہ کہہ کر ڈاکٹر عدیل میری طرف بڑھا اور میں گھبرا کر پیچھے ہوا۔ وہ وحشی درندے کی طرح میری طرف بڑھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں اب نفرت ہی نفرت تھی جب کہ میں مسلسل پیچھے ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر عدیل اس لمحے میرے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔ اب وہ بہت بھیانک لگ رہا تھا، خوش مزاجی جیسے کہیں کھو کر رہ گئی تھی۔ میں پیچھے ہوتے ہوتے لاؤنج سے گزر کر کھڑکی سے جا لگا اور عدیل کی طرف دیکھنے لگا۔ عدیل ایک ایک کرتا قدم اٹھاتا میری طرف ہی آرہا تھا اور پھر ایک دم سے وہ میرے اوپر حملہ آور ہوا۔

وہ چلّاتا ہوا خنجر والا ہاتھ اٹھا کر میری طرف آیا تھا اور میں نے کس کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس لمحے تعاقت میں میں عدیل سے کہیں زیادہ تھا اور مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس کے ہاتھ سے خنجر چھیننے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر مجھ پر قیامت تب ٹوٹی جب کھڑکی میں سے کسی نے میری

کمر کو پکڑ کر کھینچا۔

میرے منہ سے چیخ نکلی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ محمد وقاص کھڑکی پر ٹنگا ہوا مجھے پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس لمحے محمد وقاص مکمل طور پر مردہ جسم محسوس ہو رہا تھا مگر اس کا جسم حرکت میں تھا۔ ایسا لگا جیسے مردہ جسم کے اندر کوئی شیطان گھس گیا ہو۔

اب میرے اوپر دونوں طرف سے قیامت ٹوٹ رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر عدیل کی طرف دیکھا اور جیسے میرا خون جسم میں ہی خشک ہو گیا۔ عدیل کا چہرہ اس لمحے بہت بھیانک ہو گیا تھا، اس کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں اور چہرہ بھیڑیے جیسا۔ اس کے چہرے پر اب وہ خوبصورتی نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے تھی۔

عدیل کسی بھی لمحے خنجر میرے سینے کے آر پار کرنے والا تھا، میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس لمحے کیا کروں، اچانک میرے ذہن میں بجلی کی طرح سے ایک خیال آیا اور میں نے ایک لات عدیل کے پیٹ میں جڑ دی۔

''آووویا!''

عدیل شیطانی آواز میں بُری طرح ڈکرایا اور اس کے ہاتھ سے خنجر نکل گیا۔ یہی موقع میرے لیے کافی تھا، میں نے ایک لات اس کے سینے پر ماری اور وہ اڑ کر سیڑھیوں سے ہوتا ہوا نیچے جا گرا۔ اب میں نے پلٹ کر کہنی محمد وقاص کے چہرے پر ماریں اور اس کا چہرہ پھٹ گیا۔ جلد ہی وہ بے دم ہوا اور اس کا جسم سیدھا بیس فٹ نیچے گرا۔

میری سانس پھول چکی تھی۔ اب میرے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اسی حالت میں میں نے عدیل پر ایک نظر ڈالی تو وہ مجھے اکمل کے دروازے کے پاس پڑا ہوا نظر آیا۔ میں پھولی ہوئی سانس کے ساتھ نیچے اترنے لگا۔ عدیل اپنے ہاتھ فرش پر رکھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اکمل کے کمرے کے دروازے پر پڑی اور جیسے اس کا خون جم گیا۔

''آہ.... آہ.... آہ.... آہ....''

عدیل کے منہ سے خوف سے ہلکی ہلکی چیخ نکلنے لگی اور میں ٹھٹھک کر رکا۔ عدیل بے حد ڈرا ہوا دروازے کو دیکھنے لگا اور اس کی آنکھوں میں دنیا جہاں کا خوف سما گیا۔ اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے اور جسم پر جیسے رعشہ طاری ہو گیا۔ میں حیران ہو کر اس کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ رہا تھا۔

اچانک عدیل اپنے بالوں کو کھینچ کر چیخ پڑا۔اس کی بھیانک چیخیں میرا دل دہلا گئیں اوراس گھر میں بسنے والے آسیب کا بھی۔ کیوں کہ ایک بار پھر پورا گھر چیخوں سے گونج رہا تھا۔عدیل کے منہ سے نکلنے والی چیخیں اس کے حلق کی آخری چیخیں تھیں، کیوں کہ اسی لمحے وہ منہ کے بل نیچے گرااوراس کا جسم ساکت ہوگیا۔عدیل کا دل بند ہو چکا تھا....وہ مرگیا تھا۔

اس کی موت کے ساتھ گھر ایک بار پھر خاموشی میں ڈوب گیا۔میں سکتے کے عالم میں اپنے بیٹے کے کمرے کے دروازے کو تکنے لگا۔نجانے ایسا کیا تھا اس دروازے میں کہ جوان لوگوں کو بے بس کررہا تھا۔میں سکتے کے عالم میں دروازہ تکتا رہا۔میں نے کانپتی نظروں سے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پرنظر ڈالی تو لکھا ہوانظر آیا:

4:58:35

صرف پانچ گھنٹے کا وقت بچا تھا۔

☆......☆

Chapter 5

ہیونلی ویلیز اب اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دوسری اسٹریٹس پر لوگ اپنے گھروں میں اپنے خاندان کے ساتھ چین کی نیند سو رہے تھے۔ کوئی اپنی بیوی بچّوں کے ساتھ سکون بھری زندگی بسر کر رہا تھا تو کوئی اپنے ماں باپ کے ساتھ تھا۔ کہیں یونیورسٹی کے دوست ایک ساتھ کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے تو کہیں نیا شادی شدہ جوڑا ایک دوسرے کی بانہوں میں رات بسر کر رہا تھا۔ اسٹریٹ ایٹ، اسٹریٹ نائین، اسٹریٹ ٹین سب ہی جگہ زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ مگر اسٹریٹ ٹویلو کے ہاوس نمبر 24/10 پر عذاب نازل تھا، یہ گھر کسی دوزخ سے کم نہ تھا۔

سائیں سائیں کرتی ہوائیں جب اس گھر کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے گزرتی تو میرا دل دہلا جاتیں۔ میں کانپ کر رہ جاتا۔ نجانے اور کتنی آفتیں مجھ پر آنا باقی تھیں اور کتنی ہی آفتوں کو میں جھیل چکا تھا۔ مجھے تو اب صحیح سے یاد تک نہ تھا کہ میرے اوپر کیا کچھ گزر چکی ہے۔ پہلے محمد وقاص، پھر ڈاکٹر عدیل اور پھر صبا کی لاش میرے کمرے میں، یہ سب باتیں میرے لیے بے حد عجیب اور خوفناک تھیں۔ میں اس وقت سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا اپنے بیٹے کے کمرے کو تک رہا تھا۔ نجانے ایسا کیا تھا اس دروازے میں جسے ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد دیکھ کر سب کے دل بند ہو رہے تھے۔ شاید ان سب کی موتیں مجھے واپس دکھائی دے رہی تھیں۔

ایسا کیا راز تھا اس دروازے میں؟ میں کانپتی ہوئی نظروں سے اپنے بیٹے کے کمرے کو تک رہا تھا۔ مجھے اس لمحے حنا اور فراز کی بے حد ضرورت تھی، میرا دل چیخ چیخ کر انہیں پکار رہا تھا مگر میرے دل کی پکاریں کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ میں رونے لگا، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں

کیونکر واپس اپنے گھر آیا کیوں اور اس شیطانی چکّر میں پھنسا۔ اگر میری زندگی کی اب کوئی خواہش تھی تو بس یہ کہ میں اس گھر سے جلد از جلد نکل جاؤں۔

اس خیال کے آتے ہی بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ سارے فساد کی جڑ میرے دو سال کے بیٹے کا کمرہ تھا، اگر کسی طرح میں اس دروازے کو کھول دوں تو شاید کسی بڑی حقیقت سے پردہ ہٹا سکتا ہوں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میرے خون نے جوش مارا اور مجھ میں ایک نئی روح دوڑ گئی۔ امید کی ایک چھوٹی سی کرن نظر آئی جسے میں اب ہر صورت میں پورا کرنا چاہتا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک بہت بڑا خنجر تھا مگر خنجر کی مدد سے میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے ضرورت کسی مضبوط چیز کی تھی۔ بھلا مجھے مضبوط چیز کہاں اور کیسے مل سکتی تھی؟

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک بیس منٹ کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔

دروازہ دیوار سے جا کر بری طرح ٹکرایا!!! اور میں تڑپ کر دروازے کی طرف تکنے لگا۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور سیڑھیاں خاموشی سے نیچے جاتی ہوئی نظر آئیں۔ میں تہ خانے کی طرف تکنے لگا۔ میرا دل اس وقت بری طرح دھڑک رہا تھا اور ماتھے پر پسینہ چمک اٹھا۔ میرے دل میں بجلی کی طرح سے یہ خیال آیا کہ مجھے تہ خانے میں سے کوئی کارآمد چیز مل سکتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا اور کچن کی طرف بڑھا۔ کیبنٹ کے دروازے کھولے اور اندر سے موم

بتّی نکالی اور اسے دیا سلائی سے جلایا۔ واپس پلٹ کر تہ خانے کے پاس پہنچا تو وہ ویسے ہی کھلا نظر آیا۔ میں نے گہرا سانس لیا اور تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیا۔

اندر گھپ اندھیرا تھا اور موت کی سی خاموشی۔ ایک بار پھر میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا مگر میرا نیچے جانا بہت ضروری تھا۔ آخر کار میں نے ایک ایک کر کے قدم اٹھائے اور نیچے کی جانب چل پڑا۔ ہر سیڑھی پر قدم رکھ کر میرا دل جیسے سکڑ کر رہ جاتا مگر میں نیچے جانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاس ہتھیار کی صورت میں بس ایک خنجر تھا اور وہ کس حد تک کارآمد تھا میں نہیں جانتا تھا۔ آخر کار میں نیچے پہنچ گیا اور موم بتّی چاروں طرف گھمائی۔

مٹی کے بنے فرش پر مجھے کئی بڑے اور بدبودار چوہے دوڑتے ہوئے نظر آئے جس میں شاید حیرت کی کوئی بات نہ تھی، ویسے بھی تین سال سے بند تہ خانے میں چوہوں کا ہونا لازمی تھا۔ میں ہمّت کر کے تھوڑا آگے بڑھا تو تہ خانے کی چھت پر سیوریج کے پائپ جاتے ہوئے نظر آئے، جن میں سے کئی ٹپک رہے تھے۔ سنسناتی سی خاموشی اس لمحے خاصی خوفناک لگی۔ میں ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا مجھے ضرورت کسی مضبوط چیز کی تھی جس سے میں اپنے بیٹے کا کمرہ کھول سکتا۔

اچانک ایک زوردار آواز سنائی دی۔ میں بری طرح اُچھلا۔

دائیں طرف سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی تھی۔ روشنی دائیں طرف کی تو دیکھا ایک موٹے چوہے نے اسٹیل کا کنستر گرا دیا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور دوبارہ سے

نظریں دوڑانے لگا تو یہ دیکھ کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ دیوار پر ایک مضبوط اور تیز ترین کلھاڑی ٹنگی ہوئی تھی۔

''اوہ شکر خدا....''

میرے منہ سے نکلا اور کلھاڑی کی طرف بڑھا۔ بائیں ہاتھ سے میں نے کلھاڑی کو اتارا اور اپنے ہاتھ میں لیا۔ یہ واقعی ایک مضبوط کلھاڑی تھی مگر اس کی دھار پر خون جما ہوا تھا، گاڑھا خون۔ میں حیران ہو کر کلھاڑی کو دیکھنے لگا، شاید اس کلھاڑی سے میں نے کبھی کسی جانور کا شکار کیا ہو، مجھے ٹھیک سے یاد نہیں تھا مگر کلھاڑی ہاتھ میں لے کر میں نے اپنے آپ کو کافی حد تک محفوظ محسوس کیا۔

''اب مجھے اس کمرے کی حقیقت جاننے سے کوئی نہیں روک سکتا.... کوئی نہیں.... کوئی....''

میں یہ الفاظ کہتا ہوا پلٹ ہی رہا تھا کہ جیسے الفاظ میرے منہ سے کہیں کھو گئے۔ میری آنکھیں پھٹ پڑیں اور خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ برسوں سے بند اس تہ خانے میں کسی کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اور اس لمحے میں تہ خانے میں اکیلا تھا، مگر میں نے محسوس کیا جیسے کوئی سایہ.... کوئی عجیب سا سایہ.... جس کا نا وجود ہے.... نا اس کا جسم ہے.... میری طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ وجود نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی روح کو میں محسوس کر سکتا تھا۔ بلا شبہ میں اس تہ خانے میں اکیلا نہیں تھا، کوئی تھا جو موجود تھا۔

یہ سایہ کوئی عورت تھی یا روح.... یا کچھ اور میں نہیں سمجھ پا رہا تھا.... مگر آہستہ آہستہ وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔

خوف کے عالم میں میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ مجھے میری ریڑھ کی ہڈّی سن ہوتی محسوس ہوئی۔ دہشت کا وہ عالم تھا کہ میں بیاں نہیں کر سکتا۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ سایہ مسلسل میری طرف بڑھ رہا ہے۔ بدحواسی میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ میرے پاوں سن پڑ رہے تھے۔ جسم اکڑ رہا تھا۔ مگر زندگی کس کو پیاری نہیں ہوتی، اسی زندگی کے لیے میں اوپر کی طرف بھاگ رہا تھا، اپنی جان کے لیے، اپنی سانسوں کے لیے۔ آخر کار میں اوپر پہنچا اور میں نے پلٹ کر دروازہ بند کرنا چاہا تو دھک سے رہ گیا، سایہ بس مجھ سے کچھ ہی دور تھا۔

دہشت اور خوف سے میرے منہ سے چیخ نکلی اور میں نے دروازہ جھٹ سے بند کر دیا۔ اگر مجھ سے ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہوتی تو شاید میں اس اندھیری موت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گلے لگا چکا ہوتا مگر میں نصیب والا تھا جو بچ گیا۔ دروازہ بند کر کے میں نے اسے جلدی سے لاک کیا مگر اچانک کان پھاڑ دینے والی چیخیں پورے گھر میں گونجنے لگیں۔

تڑپ کر اپنے کانوں پر ہاتھ نہ رکھتا تو یقیناً بہرا ہو جاتا۔ چیخیں کئی آسیب اور چڑیلوں کی تھیں جو مسلسل پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔ میں آنکھیں بھینچ کر تڑپ اٹھا۔ یا خدا! یہ چیخیں میرا دل چیر رہی تھیں۔ وحشت سے میرا دل کپکپانے لگا۔ مجھے لگا کہ شاید میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بہرا ہو جاؤں گا۔ میں ان چیخوں کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ چیخیں اس قدر بے رحم تھیں کہ مجھے میرا سر پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

''خاموش!!.....''

میرے چلّانے سے فائدہ یہ ہوا کہ چیخیں یک لخت ختم ہوئیں! اور گہرا سنّاٹا چھا گیا!۔ میرا دل نکل کر حلق میں آیا۔ ایک دم اس قدر خاموشی سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ میرے رونگٹے اس وقت بری طرح کھڑے تھے اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ خوف کے عالم میں میں کھسکتا ہوا دیوار سے جا لگا اور وہاں بیٹھ کر گھر کو تکنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس وقت اوپر جاتی ہوئیں سیڑھیاں تھیں، اور بائیں طرف کچن اور اکمل کا کمرہ۔ گہرا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں گھر کو تک رہا تھا۔ میں اپنا دل حلق میں محسوس کر سکتا تھا۔

اچانک! کچن میں سے صبا چلتی ہوئی بڑے اطمینان سے لاؤنج میں آئی۔

میں دھک سے رہ گیا۔ صبا اس لمحے گھر کے کپڑوں میں تھی، اس کی سادگی ہی اس کی اصل

خوبصورتی تھی۔ وہ اطمینان سے چلتی ہوئی آئی اور صوفے پر بیٹھ کر ٹیلی ویژن آن کیا۔ ٹیوی ایک سیکنڈ میں چل گیا اور میں حیران ہوکر اسے دیکھنے لگا۔ جو ٹیوی دوپہر سے خراب پڑا تھا اب بالکل ٹھیک چل رہا تھا۔ ٹیوی پر خبریں آ رہی تھیں اور جو تاریخ نیوز کاسٹر نے بتائی وہ تین سال پہلے کی تاریخ تھی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا، میری آنکھوں کے سامنے میرا ماضی چل پڑا تھا۔ جلد ہی میں نے اپنے وجود کو سیڑھیوں پر سے اترتے ہوئے دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اس وقت انتہائی خوبصورت لباس میں ملبوس ہوں، شاید مجھے کسی دعوت میں جانا تھا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر یہ ماجرا تکنے لگا، ایسا لگا جیسے میں اپنی زندگی پر بنی کوئی فلم دیکھ رہا ہوں۔ میں چلتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے آیا تو صبا نے تجسّس سے پوچھا:

''کہیں جارہے ہیں آپ؟''

''ہاں میں ذرا دفتر کی پارٹی میں جارہا ہوں۔ مجھے دیر ہوجائے گی، تم کھانا کھا کر سوجانا۔'' میرے وجود نے جواب دیا۔

''مگر میں نے تو آج آپ کا پسندیدہ پلاؤ بنایا ہے۔'' صبا نے پریشان ہوکر کہا۔

''جانتا ہوں baby .... لیکن تمھیں پتا ہی ہے دفتر کے معاملات۔ باس سے بنا کے رکھنی پڑتی ہے۔'' میرے وجود نے اسے دیکھ کر جواب دیا۔

''روحیل۔''

صبا نے میرا نام بہت پیار سے لیا اور وہ صوفے سے اٹھ کر میرے وجود کی طرف بڑھی۔ اس نے پیار سے میرے وجود کے شانوں پر ہاتھ رکھا:

''دیکھیے .... میری بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے .... مجھے۔۔اکمل کو.... اس گھر کو آپ کی بہت ضرورت ہے.... آپ پلیز میرا ساتھ دیں.... آپ تو دعوت میں جارہے ہیں.... مگر گھر میں راشن نہیں ہے.... اگر میں آج اپنی سہیلی سے ادھار مانگ کر نہ لاتی تو آج رات کا کھانا بھی نہیں بن سکتا تھا۔ اور آپ آج اس کھانے کو چھوڑ کر جارہے ہیں.... پلیز ایسا مت کیجیے.... آج رک جائیے۔'' صبا نے پیار سے التجا کی۔

''صبا....'' میں نے پیار سے اس کا نام لیا اور کہا:

''تمھیں ایسا لگتا ہے کہ مجھے اس چیز کا اندازہ نہیں ہے؟ تم لوگوں کی خاطر ہی میں دفتر کی

پارٹی میں جا رہا ہوں تاکہ مجھے ترقی مل سکے۔ میں چوبیس گھنٹے کام اس لیے ہی کر رہا ہوں تاکہ تم لوگوں کے لیے کچھ کر سکوں....'' میرا وجود پیار سے کہتا گیا۔

''روحیل.... میں کیسے سمجھاؤں آپ کو....'' صبا نے نظریں جھکا کر یہ جملے کہے۔

''کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟'' میرے وجود نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''روحیل....'' صبا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں یہ جملے کہے پھر پلٹ کر کہنے لگی:

''پتا نہیں.... پتا نہیں کہ میں صحیح ہوں.... یا غلط.... مگر ایک انجانا سا خوف.... میرا پیچھا کر رہا ہے.... مسلسل ایسا لگتا ہے.... کہ جیسے کوئی اندھیرا اس گھر میں ہے.... جو میری جان لینا چاہتا ہے.... میرے بیٹے کو مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے.... میں نہیں جانتی کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے.... مگر.... یہ خوف.... یہ خوف مجھے اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔''

صبا کی بات سن کر میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔

''ایک عجیب سا اندھیرا جیسے اس گھر پر چھا رہا ہے.... یہ اندھیرا مجھے دیکھتا رہتا ہے.... مجھ سے کچھ کہتا رہتا ہے.... اس کے الفاظ بہت ٹھیک ہیں.... پر مجھے اس اندھیرے کی زبان سمجھ نہیں آتی.... بس.... اگر کچھ محسوس ہوتا ہے.... تو ایک انجانا سا خوف.... ایک بیگانی دہشت.... جو میرے خون کو جمائے رکھتی ہے....''

یہ کہہ کر صبا نے میری طرف دیکھا اور میرے قریب آ کر اس کے لب ملے:

''رک جایئے پلیز.... مت جایئے.... مجھے یہ خوف کھا جائے گا۔''

اس کی بات سن کر میرا وجود مسکرایا:

''ایسی باتیں سوچو گی تو دل ہی گھبرائے گا نا؟ جان میری.... ریلیکس رہو.... کوئی اندھیرا.... کوئی خوف ہمارا پیچھا نہیں کر رہا.... جب تک میں ہوں.... تمھیں اور اکمل کو کچھ نہیں ہو سکتا.... یہ میرا وعدہ ہے۔''

میرے وجود کے الفاظ سن کر صبا کو کچھ اطمینان ہوا۔

''بھروسا ہے نا مجھ پر؟'' میرے وجود نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''بالکل بھروسا ہے.... مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے روحیل.... جب آپ میرے لیے پاگلوں کی طرح کالج کے باہر انتظار کیا کرتے تھے.... مجھ سے پیار کرتے تھے.... جینے مرنے کی

قسمیں کھاتے تھے.... دیکھتے ہی دیکھتے میں آپ سے زیادہ آپ کو چاہنے لگی.... آپ سے شادی کی.... آپ کو اپنایا.... ہماری محبت نے اکمل کو جنم دیا.... بس.... ڈر لگتا ہے.... کہ یہ سب کچھ کھو نہ جائے....''

یہ کہہ کر صبا رونے لگی اور میرا وجود اسکا چہرہ تکنے لگا۔ دوسری طرف دیوار سے ٹیک لگائے میں بھی صبا کے آنسو کو دیکھنے لگا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا.... بھروسا رکھو مجھ پر.... او کے؟''

میرے وجود نے اسے دیکھ کر یہ جملے کہے اور صبا خاموش ہوئی۔

''چلو میں چلتا ہوں۔۔ جلدی آنے کی کوشش کروں گا.... تم دروازہ بند کر لینا۔''

میرے وجود نے جواب دیا اور نکلتا چلا گیا۔ صبا بے جان جسم کی طرح وہاں ہی کھڑی رہی۔ میرے وجود نے مرکزی دروازہ کھولا اور نکلتا چلا گیا۔ میں خاموشی سے یہ منظر تکتا رہا۔

میرے وجود کے چلے جانے کے بعد صبا تنہا کھڑی رہی۔ جو صبا تھوڑی دیر پہلے مطمئن ہوئی تھی، اب ایسا لگا جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہیں۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ اس لمحے صبا گھٹنوں کے بل فرش پر گری اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، کتنا بے قدر تھا میں۔ صبا نے مجھے بتانے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں سنا۔ کاش!.... کاش کے وقت پلٹ آتا اور میں صبا کو اکیلا چھوڑ کر نہ جاتا۔ مجھ سے یہ منظر برداشت نہیں ہو رہا تھا لیکن میں اس لمحے کو تکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

صبا زار و قطار اپنے گھٹنوں پر بیٹھی رو رہی تھی۔ شاید وہ ایک انجانے اندھیرے کو اپنے قریب محسوس کر رہی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنی زندگی ختم کر دینا چاہتی ہے لیکن ایک صدا نے اس کے اس قدم کو جکڑ کر رکھ دیا، اور وہ صدا میرے دو سال کے بیٹے کی تھی جس کے رونے کی آواز اس کے کمرے سے آنے لگی۔ میرا دو سال کا بیٹا شاید سوتے ہوئے اٹھ گیا تھا، اٹھتے ہی اس نے اپنی ماں کو پکارا۔

صبا نے اپنے آنسو پونچھے اور روتے ہوئے کہنے لگی:

''آ رہی ہوں میرا بچّہ۔''

یہ کہہ کر وہ اکمل کے کمرے کی طرف بڑھی۔ نہایت ہی اطمینان سے اس نے اکمل کے

کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔

میں اچھل پڑا۔ جس دروازے کو کھولنے کے لیے میں سو جتن کر چکا تھا صبا نے اسے ایک ہی سیکنڈ میں کھول لیا تھا، اور اب وہ اندر اکمل کے پاس تھی ۔ میں حیرت اور خوف کے عالم میں اکمل کے کمرے کے دروازے کو تکنے لگا۔

☆......☆

گہرا سناٹا.... گہری رات.... اندھیرا.... اور آسیب.... یہ چار حقیقتیں میرے اردگرد گھوم رہی تھیں ۔ مگر میں ان حقیقتوں کو بھلا کر اکمل کے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ خاموش اور ساکت میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے دروازے کو اچھی طرح سے دیکھا اور پھر اس کا ہینڈل پکڑ کر اسے کھولنا چاہا، مگر وہ نہیں کھلا۔ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں نے ہینڈل چھوڑا اور ڈرتے ہوئے اپنے کان دروازے پر لگا دیئے، شاید میں اندر سے صبا اور اپنے بچّے کی آواز سن سکوں ۔ مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دیا۔ اندر بلا کی خاموشی تھی ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے صبا کو اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر اب صبا کی آواز آئی نہ ہی میرے نومولود بچّے کی ۔ میں پیچھے ہٹا اور دروازے کو تکنے لگا۔ دروازہ انتہائی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا پر کلھاڑی سے ٹوٹ سکتا تھا۔ میں نے کلھاڑی کو سیدھا کیا اور دروازے کا نشانہ لے کر کلھاڑی دے ماری۔

کھٹک کی آواز گونجی اور کلھاڑی نے دروازے کی لکڑی نکال دی۔ میں نے کلھاڑی پھر پیچھے کی اور ایک بار پھر دروازے پر ماری۔

اس بار کلھاڑی بڑے زور سے پڑی اور دروازہ ہل گیا، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کٹ کر گرے مگر دروازہ ابھی تک اپنی جگہ پر موجود تھا۔

اب مجھ پر دیوانگی طاری ہوگئی اور میں کلھاڑی دروازے پر برسانے لگا۔ دروازے میں جگہ جگہ سوراخ ہو رہے تھے اور لکڑی ٹوٹ کر بکھر رہی تھی مگر دروازہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ مجھ پر اکتاہٹ طاری ہونے لگی، میرے بدن میں بے چینی پھیل چکی تھی ۔ میں کسی بھی حال میں یہ دروازہ توڑنا چاہتا تھا۔ میں نے غصے کے عالم میں کلھاڑی کچھ اس زور سے دروازے پر ماری کہ ایک چیخ گھر میں گونج اٹھی!

چیخ کس بلا کی تھی، جیسے کلھاڑی اسے جا کر لگی ہو۔ میں دھک سے رہ گیا اور ایک دم سے

اکڑو بیٹھا۔خوف کے عالم میں چاروں طرف نظر دوڑانے لگا مگر گہرا سناٹا پھر طاری ہو گیا۔

گہری خاموشی میں میری نظریں چاروں طرف سفر کر رہی تھیں مگر کوئی نظر نہ آیا۔ میں نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا تو الجھن سے بھنویں اوپر کو چڑھ گئیں۔ پہلے تو مجھے لگا کہ میرا وہم ہے مگر ایک دو بار آنکھیں مل کر جب دیکھا تو صاف یہ منظر نظر آیا۔کلھاڑی کی چوٹ جو دروازے پر پڑی تھی وہاں سے خون کی پتلی سی لکیر بہنے لگی۔ میں حیران ہو کر اس خون کو دیکھنے لگا۔ خون مسلسل بہنے لگا۔ یہاں تک کہ اب وہ فرش پر گر رہا تھا۔ میں سکتے کے عالم میں یہ منظر دیکھنے لگا۔اچانک میں نے دیکھا خون کی رفتار میں تیزی آ رہی ہے،خون اب تیزی سے بہہ رہا ہے۔ میں دھک سے رہ گیا اور دروازے کے ہر سوراخ کو تکنے لگا۔ اچانک دروازے کے ہر سوراخ سے خون میرے اوپر آیا۔

میں چلّا اٹھا!بری طرح خون میں نہا گیا!۔خون اس تیزی سے بہہ رہا تھا جیسے یہ خون کا سیلاب ہو!۔میرے منہ پر،میرے بدن پر خون اس تیزی سے آ رہا تھا کہ میں کچھ دیکھنے کے قابل نہ رہا۔اچانک چھت پر سے مجھ پر خون کی بارش ہونے لگی!۔دیکھتے ہی دیکھتے پورا گھر خون کا سمندر بن گیا۔میں اس خون میں ڈوبنے لگا۔

خون اس قدر تیزی سے گھر میں بھرنے لگا کہ جلد ہی وہ میرے سینے تک آ پہنچا۔میں جان گیا کہ جلد ہی میں اس خون کی ندی میں ڈوب کر مر جاؤں گا!!.....میں پھنس چکا تھا.....بری طرح پھنس چکا تھا۔گھبراہٹ کے عالم میں ادھر ادھر ہاتھ چلانے لگا،میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں!۔جیسے تیسے تیرتا ہوا میں زینے کی طرف پہنچا۔دوسری منزل کی طرف جانے کی کوشش کی!۔میں سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کرنے لگا،خون کی وجہ سے میرا پاوں بار بار سلپ ہو رہا تھا۔ دروازے سے خون اور چھت سے خون ابھی بھی بہت رفتار سے بہہ رہا تھا۔میں سیڑھیاں اوپر چڑھنے لگا کہ اچانک خون کی لہریں سیڑھیوں پر سے بہتی ہوئی نیچے آئیں!۔

میرے منہ سے چیخ نکلی اور خون کی ایک بڑے لہر میرے اوپر پڑی۔ میں الٹ کے چھپاک سے خون کے سمندر میں گرا۔اس لمحے میں مکمل طور پر خون میں بھیگ چکا تھا۔خون کی تہہ دیواروں پر جم رہی تھی،اگر اسی رفتار سے یہ لہو بہتا رہا تو بہت جلد میں اس لہو میں ڈوب کر مر جاتا۔ میں نے ہمّت کی اور دوبارہ اوپر جانے کی کوشش کرنے لگا۔لہروں سے لڑتا ہوا اب

میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ نیچے کی منزل خون کا دریا بن چکا تھا اور اس سیلاب میں ابھی بھی کوئی کمی پیشی نہیں آئی تھی۔ میں لہروں سے لڑتا ہوا اوپر جانے لگا، اور بالآخر میں اوپر پہنچ ہی گیا۔ سیڑھیوں کے سرہانے کو پکڑ کر میں نے جو سیدھا اپنے کمرے کی طرف دیکھا تو خون کی لہروں کو اپنے کمرے سے آتے ہوئے پایا۔ میں بے بسی کے عالم میں یہ منظر دیکھنے لگا کہ اچانک میری نظر ٹیریس کے دروازے کی طرف پڑی۔ میں ٹیریس کے دروازے سے باہر نکل سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ سیلاب میں اور بارش کی تیزی میں ابھی بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بے انتہا محنت اور مشقت کے بعد میں ٹیرس کے دروازے پر پہنچا، اس کی کنڈی کھول کر ہینڈل پکڑ کر کھینچا اور دروازہ کھول دیا۔

جیسے ہی دروازہ کھولا کہ اچانک ایک شخص میرے اوپر آ کر گرا اور ہم دونوں منہ کے بل فرش پر گرے!۔ اس شخص کا گھر میں آنا تھا کہ بارش یکا یک رک گئی، بہتی ہوئی خون کی لہریں جیسے غائب ہوگئیں۔ اکمل کے کمرے سے خون کے فوّارے نکلنا بند ہوگئے۔ خون کچھ اس طرح غائب ہوا جیسے کہ تھا ہی نہیں۔ صرف میں اور میرے کپڑے خون میں بری طرح بھیگے ہوئے تھے۔ کیا خون کا سمندر محض میرا خیال تھا؟ اگر یہ صرف خیال تھا تو میرے کپڑے خون میں کیسے بھیگے ہوئے تھے؟ میں ابھی یہ سب باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے اپنے برابر پڑے ہوئے شخص کو کھانستے سنا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ یہ کوئی اور نہیں اس گھر میں داخل ہونے والا بھکاری تھا..... اس گھر کا شکار ہونے والا تیسرا شخص۔

☆......☆

اندر آنے والے بھکاری کا جسم بری طرح سے کانپ رہا تھا، جیسے کہ برف کی وادی سے نکل کر آ رہا ہو۔ میرے چہرے پر بھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پڑے اور میں نے چونک کر ٹیرس کے دروازے کی طرف دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ ٹیرس میں سے اس قدر ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں جیسے دسمبر کا مہینہ چل رہا ہوں۔ حالانکہ اس وقت اپریل کا مہینہ چل رہا تھا جو کہ کراچی میں بہت گرم ہوتا ہے۔ اب میں نے بوڑھے شخص کی طرف دیکھا تو وہ مسلسل کانپ رہا تھا۔ اس کے جسم پر سرمئی رنگ کا پھٹا ہوا کرتا شلوار تھا اور ایک پھٹا ہوا جیکٹ۔ اس کے سر کے اور داڑھی کے بال سفید تھے اور چہرے پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کا بدن بخار سے تپ رہا تھا اور نجانے وہ کب سے اس

بخار میں مبتلا تھا۔اس کی حالت دیکھ کر اندازہ ہورہا تھا کہ یہ شخص بہت دیر سے سردی میں تڑپتا رہا ہے۔

"It's okay... It's okay..."۔میں نے یہ کہہ کر اسے اٹھایا۔

''آہ!....''

وہ کراہنے لگا اور میں اسے لے کر نیچے کی منزل کی طرف چلا۔میں اس وقت خون میں بھیگا ہوا تھا مگر نیچے کی منزل پہلے کی طرح بالکل صاف ستھری تھی۔صرف اکمل کے کمرے کے دروازے پر میری کلھاڑی برسانے کے نشان موجود تھے۔خون کا اب نام ونشان تک موجود نہیں تھا۔

میں بوڑھے شخص کو لے کر نیچے آیا اور اسے صوفے پر لٹایا۔

''آہ!!....''

اس کے منہ سے تکلیف کے عالم میں نکلا اور وہ صوفے پر لیٹ گیا۔اس کو لٹا کر میں کچن کی طرف بڑھا۔دراز کھولی اور ایک کپڑا نکال کر جلدی جلدی اپنا منہ، ہاتھ اور جسم کو صاف کیا۔کپڑے کو ایک طرف پھینک کر میں گہرا سانس لینے لگا۔یہ سب کیا ہورہا تھا؟ خون کی ندیاں کہاں گئی؟ اگر وہ محض میرا خیال تھا تو میں کیوں خوں میں بھیگا ہوا ہوں۔ان سوالوں کو بھلا کر میں نے گہرا سانس لیا۔میں نے برابر میں رکھا ہوا گلاس اٹھایا اور اس میں پانی بھرا۔اب میں پانی کا گلاس لے کر دوبارہ لاؤنج کی طرف چلا۔

''یہ لو....پانی پی لو....''

میں اطمینان سے اس بوڑھے شخص سے مخاطب ہوا اور اس کے لبوں سے گلاس لگایا۔پانی کے کچھ گھونٹ پی کر اسے ہوش آیا۔ایسا لگا جیسے کھوئی ہوئی جان اس میں واپس آگئی ہو۔وہ مردہ نگاہوں سے چھت کو تکنے لگا۔کچھ پل اسی حالت میں بیت گئے۔میں اس شخص کو تکتا رہا اور وہ خالی نظروں سے چھت تکنے لگا۔کھانسی نے ایک بار پھر اس کے جسم کو جنبش دی۔تھوڑی دیر کھانس کر اس نے مجھے دیکھا:

''تم۔۔تم کون ہو؟''

اس کے یہ سوال پوچھنے پر میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور فرش کو تکنے لگا:

”کوئی نہیں.... میری کوئی پہچان نہیں.... بس.... ایک بدنصیب ہوں....“

میری بات سن کے وہ کھانس کر فرش کو تکنے لگا۔

میں نے اسے ایک نظر دیکھا:

”تمھارا نام یوسف ہے نا؟“

میرے سوال پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی۔

”تم.... تمھیں.... تمھیں میرا نام کیسے پتا چلا؟ میں نے تو اپنا نام پچھلے بارہ برس سے خود نہیں پکارا۔“

انتہائی حیرت کے عالم میں اس نے یہ سوال کیا تھا لیکن میں اس کے اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ بس.... سرد آہ لے کر اسے دیکھنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ میرے سامنے موجود مردہ ہے اور کچھ پل بعد وہ دل کے دورے سے مرنے والا ہے۔ میں اس وقت ماضی کو دیکھ سکتا تھا اس لیے یہ سب کچھ مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ حقیقت کیا ہے؟ میں کون ہوں؟۔ وہ کس گھر میں موجود ہے؟ یہ تفصیلات بتانا اسے مجھے بیوقوفانہ عمل لگا۔ اس لیے اداس مسکراہٹ لبوں پر لا کر میں نے جواب دیا:

”پتا نہیں.... پتا نہیں مجھے تمھارا نام کیسے پتا چلا.... دل کبھی کبھی بہت سی چھپی باتوں کو جان ہی لیتا ہے۔“

”آہ.... دل....“ یوسف نے چھت کو تکا۔

”بچّہ ماں کے پیٹ میں صحیح سے بنا نہیں ہوتا کہ یہ دل دھڑکنا شروع کر دیتا ہے.... اور آخری سانس تک دھڑکتا رہتا ہے.... جب رات کی تاریکی میں جسم کی ہر چیز آرام کر رہی ہوتی ہے.... تب بھی یہ دل جاگ کر جسم کی رکھوالی کر رہا ہوتا ہے.... ہم ساری زندگی اس دل کو کسی نہ کسی کے حوالے کرتے آئے ہیں.... کبھی بچّوں پر دل آ گیا.... تو کبھی پالتو کتے پر.... کبھی بیوی پر دل آ گیا.... تو کبھی محبوبہ پر.... اس دل کا سودا ہم ساری زندگی کرتے ہیں.... شاید.... شاید اسی لیے یہ دل تنگ آ کر ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے....“

یوسف اپنی ہی دھن میں کہتا چلا گیا اور میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔

”میری صحت میرا ساتھ چھوڑ چکی ہے.... موت کب آ کر مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ

لے.... میں نہیں جانتا.... مجھے خون کی الٹی ہوتی ہے.... میرا جگر جیسے مستقل جل رہا ہے.... میں جانتا ہوں کہ میں بس مرنے والا ہوں.... ایک بہت ہی عجیب زندگی گزار کر.... میں بس مرنے والا ہوں۔''

یوسف نے مایوسانہ لہجے میں اپنی بات کہی۔

''کیا میں آپ کی زندگی کی کہانی سن سکتا ہوں؟''

میں نے اسے دیکھ کر پوچھا اور وہ اداس مسکراہٹ اپنے چہرے پر لے آیا:

''کیا بتاؤں تمھیں؟ کیا سناؤں اپنی بربادی کی داستان۔ میں کوئی اچھا انسان تو ہوں نہیں۔ جس کی زندگی کو سن کر لوگ کچھ سبق حاصل کر سکیں۔''

''لیکن اس وقت ہم دونوں ساتھ ہیں۔ شاید ہم دونوں ایک دوسرے سے اپنا غم کہہ کر.... اس زندگی سے کچھ حاصل کر سکیں۔''

میں نے دھیرے سے یہ جملے کہے اور وہ اداس مسکراہٹ چہرے پر لا کر کہنے لگا:

''صحیح کہا تم نے۔ پچھلے کئی سالوں سے میں نے بھی کسی سے بات نہیں کی، تم پہلے شخص ہو جو مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہو تو یونہی سہی۔ میری کہانی کچھ نہیں، بس ایک بربادی کی داستان ہے۔ اگر ہمیشہ سے برباد ہوتا تو اس قدر غم نہ ہوتا، مگر آہستہ آہستہ بربادی کو گلے لگانا بڑا تکلیف دہ عمل ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے میں ملتان میں پیدا ہوا تھا اور کم عمری میں ہی کراچی آ گیا تھا۔ گھر میں پیسہ نام کی چیز نہیں تھی اس لیے مجھے کم عمری سے ہی کاروبار کرنا پڑا۔ حلال سے لے کر حرام تک کمایا میں نے، چرس، ہیروین کا کاروبار کیا میں نے۔ کیا کرتا، دوسروں کی رگوں میں خون بھر کر اپنے گھر والوں کا پیٹ جو پالنا تھا۔ میں اپنی ہی دھن میں کام کرتا چلا گیا، میرا ساتھ دینے والے میرے دوست بھی میرے ساتھ مل کر کام کرتے رہے، میری محبوبہ نازیہ بھی میرے ساتھ ہی کام کرتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نے کافی پیسہ بنا لیا۔ میں نے گھر خریدا، گاڑی خریدی اور زندگی میں اپنا نام کما لیا۔ جو میرے نصیب میں نہیں لکھا تھا میں نے وہ قسمت سے نوچ کر حاصل کر لیا تھا۔ اس دوران میں نے نازیہ سے شادی کر لی اور زندگی جیسے خوبصورت ترین سفر بن گئی۔ میرے والدین نے بھی نازیہ کو قبول کر لیا اور مجھے میرا گھر مل گیا۔''

وہ کہتا گیا اور میں اسے تکتا رہا۔

’’یہیں سے میری بربادی کی داستان شروع ہوتی ہے، جب نازیہ نے مجھے بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا۔ مجھے لگا کہ وہ مجھے ماں بننے کی خوش خبری سنانے والی ہے، اس لیے اپنے کارخانے کو چھوڑ کر دوڑا گیا اس کے پاس، اسے بانہوں میں لے کر اس کا چہرہ دیکھا اور سوال کیا۔ مگر جواب میں اس نے بتایا کہ اسے بلڈ کینسر ہو گیا ہے۔ میرا جسم جیسے سن پڑ گیا.... اور دماغ نے کام کرنا بند کر دیا۔ میں بس اس کا چہرہ تکتا رہ گیا، وہ جلد ہی دم توڑ گئی۔ زندگی میں سب کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی میں اکیلا رہ گیا تھا۔ نازیہ کے جانے کے بعد جیسے مجھ میں زندگی کی کوئی چاہ نہیں رہی، اور شاید اس کے جاتے ہی قسمت نے بھی مجھ سے منہ پھیر لیا۔ پولیس نے چھاپہ مارا اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ، اپنے ساتھیوں کے ساتھ مال سمیت پکڑا گیا۔ مجھے آٹھ سال کی قید با مشقت سزا ہوئی اور میری زندگی اندھیروں میں کٹنے لگی۔ دو سال ہی گزرے ہوں گے کہ میں جیل سے فرار ہوا اور سیدھا ملتان پہنچا، اپنے والدین کے پاس۔ میرے والد صاحب نے مجھے اپنے گھر میں پناہ کی اجازت دی مگر میری ماں اصول پسند عورت تھی، نجانے کب اس نے پیچھے سے پولیس کو فون کر دیا اور کب پولیس نے آکر مجھے پکڑا، مجھے اس بات کا علم ہی نہیں ہو سکا۔

’’اوہ....‘‘ میرے منہ سے نکلا۔

’’مجھے مارا گیا.... پیٹا گیا.... میرے جسم سے کھال تک نوچ ڈالی گئی اور میں جیل میں اپنی سزا پوری کرنے لگا۔ آٹھ سال کا لمبا عرصہ گزار کر جب میں واپس باہر آیا تو پتا لگا میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے اور میرا اپنا کوئی نہیں رہا۔ اب ایک بار پھر میری زندگی میں اندھیرا تھا اور میں اندھیروں میں بھٹک رہا تھا۔ میں لاہور چلا گیا اور وہاں محنت مزدوری کرنے لگا۔‘‘

یہاں تک کہہ کر یوسف خاموش ہوا اور کہنے لگا:

’’چار سال میں نے ایسے ہی گزار دیئے اور میں بڑھاپے کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر ایک دن مجھے میرے وہی ساتھی ٹکرائے جو میرے ساتھ دھندے میں ساتھی تھے۔ ایک بار پھر ہمارا گروپ بنا اور ہم نے چرس کا کاروبار شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم پھر سے اوپر جانے لگے۔ پیسہ، دولت، گھر، عزّت، گاڑی سب کچھ پھر سے ملنے لگا۔ اس بار مجھے شبانہ ملی، شبانہ میری ایک خوبصورت رکھیل تھی اور مجھے لگا کہ شاید یہ نازیہ کی جگہ لے سکے، اس لیے میں نے اس سے شادی کر لی۔ مجھے ایک نئی زندگی کی یہ شروعات بہت اچھی لگی اور خواہش تھی کہ پھر سے میں ویسے ہی

خوش ہوسکوں جیسے نازیہ کے ساتھ تھا۔ مگر میری زندگی میں شبانہ نے زہر گھولنا شروع کیا۔ بات بات پر لڑنا، جھگڑنا پاگلوں کی طرح گھر کی چیزوں کو توڑنا، ایک دو بار مجھے قتل کرنے کی کوشش کرنا۔ وجہ اس کا پاگل پن تھا جو بے انتہا نشہ کرنے سے اس پر طاری رہنے لگا تھا۔ کچھ عرصے بعد میری بیٹی نے جنم لیا مگر مجھے کبھی اپنی بیٹی کا پیار نہ مل سکا۔''

''کیوں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کیوں.... یہی سوال میں نے شبانہ سے کیا، کہ کیوں؟ آخر کیوں میری بیٹی میرے پاس نہیں آسکتی؟ آخر کیوں؟ تو کہنے لگی کہ میں اپنی بیٹی پر کسی بدذات کا سایہ پڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی.... میں ایک ایسے شخص کی بانہوں میں اپنی بیٹی نہیں دے سکتی جس نے حرام کمانے کے سوا کچھ نہ کیا ہو۔ کاش کوئی اس بے عقل عورت کو سمجھا پاتا کہ جس مرد کو تم حرام کا طعنہ دے رہی ہو، وہی مرد تمھیں طوائفوں کی نگری سے نکال کر لایا تھا۔ خیر.... جلد ہی شبانہ میری بیٹی کو مجھ سے چھین کر مجھ سے الگ ہوگئی اور میں اپنے ہی گھر میں اکیلا تڑپتا رہ گیا، زندگی نے ویسے ہی کچھ نہیں چھوڑا تھا.... کہ جلد ہی ایک اور قیامت ٹوٹی۔ ایک بار پھر پولیس کا چھاپہ.... اور مجھے سولہ سال کی جیل۔ وجہ میرے ساتھیوں کی غداری تھی۔ شروع شروع میں میری بیٹی مجھ سے ملنے کے لیے آتی رہی، مگر جلد ہی وہ بھی چھوٹ گیا۔ اب سولہ سال برس بعد میں جیل سے رہا ہو کر یہاں کراچی چلا آیا.... جہاں میں اور نازیہ ہنسی خوشی رہا کرتے تھے.... مگر اس کے جانے کے بعد سے زندگی میں جیسے سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا.... اب بس میں تنہائی کا شکار ہوں.... صرف تنہائی کا....''

یہاں تک کہہ کر یوسف رونے لگا اور میرا دل بھر آیا۔ اس کی کہانی واقعی بہت دردناک تھی۔ یوسف نے اپنے آنسو صاف کیے اور کہنے لگا:

''میں مانتا ہوں.... میں نے زندگی میں بہت غلط کام کیے ہیں.... میں جانتا ہوں کہ میرے گناہوں کی سزا بہت بڑی ہونی چاہیے.... مگر میں گناہ پر مجبور اپنوں کے الگ ہونے پر ہوا.... صرف اتنا قصور تھا میرا.... کہ میں اپنوں کے بارے میں سوچتا تھا.... اور اپنے مجھ سے دور ہوتے چلے گئے.... بس یہی قصور تھا میرا.... بس یہی....''

یہ کہہ کر یوسف زاروقطار رونے لگا اور میں اٹھ کر اس کے پاس گیا۔اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر گہرا سانس لیا:

''میں مانتا ہوں کہ تم سے گناہ ہوا ہے.... تم ایک انسان ہو.... تم سے بھی خطا ہوسکتی ہے....اور جتنی خطائیں تم نے کیں....اس کا ازالہ تم بھگت چکے ہو....اب تم ایک باعزت بَری انسان ہو.... دنیا کی کوئی طاقت تمھیں دوبارہ جیل میں نہیں ڈال سکتی.... تم رہا ہو چکے ہو.... تم آزاد ہو....''

''ہاں.... ہاں شاید میں آزاد ہوں.... اگر مجھے میری بیٹی کی یادیں.... میرے والدین کی یادیں.... میری نازیہ کی یادیں واپس نہ بلائیں.... تو شاید میں آزاد ہوں.... شاید میں آزاد ہوں۔''

یوسف نے حسرت کے عالم میں یہ جملے کہے اور میری آنکھیں جھلملا گئیں۔

''میں جینا چاہتا ہوں بیٹے.... میں جینا چاہتا ہوں.... چاہتا ہوں کہ جتنی عمر بھی میری بچی ہے.... وہ نماز اور روزے میں گزار دوں.... ورنہ کس منہ سے اپنے رب کے سامنے جاؤں گا؟ کس منہ سے؟''

''اور آپ اپنے رب کے سامنے ضرور جائیں.... دنیا نے اور آپ کے اپنوں نے آپ کا ساتھ چھوڑا ہے.... مگر میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔''

میں نے جذباتی ہو کر کہا اور یوسف آنسو بھری نگاہوں سے مجھے تکنے لگا۔

''تم کہاں تھے بیٹے؟ تم کہاں تھے؟''

یوسف نے مجھے دیکھ کر پوچھا اور میں اسے تکنے لگا۔

''میں پچھلے چوبیس گھنٹے سے اس گھر میں موجود ہوں، میں نے اس پورے دن میں تمھیں تو کہیں بھی نہیں دیکھا۔''

یوسف کا یہ کہنا تھا کہ میں دھک سے رہ گیا۔ یہ شخص مشکل سے دس منٹ سے اس گھر میں موجود تھا مگر اسے پورا ایک دن گزر چکا تھا۔اس لیے کہ میرے سامنے اس شخص کی روح موجود تھی۔ یوسف تو کب کا مر چکا تھا۔اس گھر میں جو بھی داخل ہوتا ہے اس کے ٹھیک چوبیس گھنٹے

بعد اس کی موت ہو جاتی ہے، اور یوسف کا وقت بھی آنے والا تھا، اسے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے اور اب وہ کچھ ہی پلوں کا مہمان تھا۔ میں اس خوفناک حقیقت کو سمجھ رہا تھا کہ میرے سامنے موجود شخص مردہ ہے مگر پھر بھی میرے دل نے اسے بچانے کی ٹھانی، شاید میں کسی کو زندگی دے پاتا۔ یہ سوچ کر میرا چہرہ فق پڑ گیا اور میں اکمل کے کمرے کے دروازے کو دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' یوسف نے حیران ہو کر پوچھا مگر میں اپنے بیٹے کا کمرہ تکتا رہا۔

''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟'' یوسف نے پھر پوچھا۔

''آپ.... آپ کو چلنا ہوگا.... فوراً۔'' میں اٹک کر بولا۔

''کہاں؟'' یوسف نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس لاؤنج سے دور، آیئے میرے ساتھ۔''

جلدی سے اسے سمجھا کر میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ بوڑھا شخص کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور میں اسے تھام کر اوپر لے جانے لگا۔

''سنبھال کے۔'' میں اسے سیڑھیاں چڑھا رہا تھا کہ تب ہی اسے اُلٹی ہوئی۔

''سنبھل کے.... سنبھل کے۔''

میں نے پیار سے کہا اور اسے تھاما، اسے خون کی الٹی ہوئی تھی اور وہ بے حد بیمار تھا۔ مجھے بوڑھے شخص پر ترس آنے لگا۔ شانوں سے تھام کر میں اسے اوپر کی منزل پر لے کر گیا اور اپنے کمرے کی طرف لے کر چلا۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ کمرے میں اب صبا کی نہ تو لاش موجود تھی نہ ہی دیواروں پر خون مگر انگریزی حروف کے وہی چند الفاظ اب ہر دیوار پر لکھے ہیں۔ کمرے میں ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں یہ الفاظ نہ لکھے ہوں۔ میں نے یوسف کو بستر پر لٹایا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بخار سے اس کا بدن تپ رہا تھا۔

''ٹھہریے میں آپ کے لیے گیلی پٹی لاتا ہوں۔''

میں نے فکر مند ہو کر یہ جملے کہے اور پلٹا تو جیسے میرے جسم کا سارا خون خشک ہو گیا۔ میری آنکھیں پتھرا گئیں اور ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ اوپر والی منزل کے برآمدے میں وہی سایہ

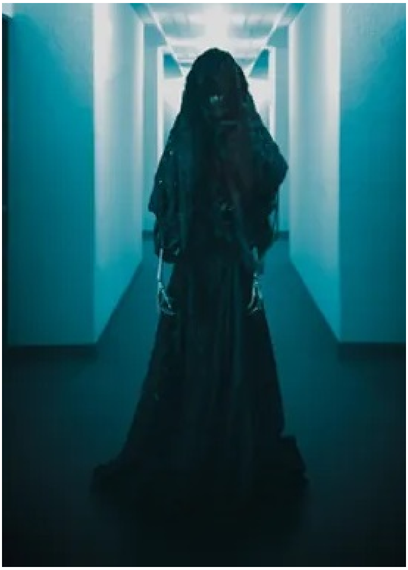

موجود تھا جسے میں تہ خانے میں بند کر آیا تھا۔

☆......☆

میں سکتے کے عالم میں کھڑا اس سایے کو تک رہا تھا، یوسف اس کی موجودگی سے بے خبر، بستر پر پڑا تھا۔ سایہ اس لمحے کچھ نہیں کر رہا تھا، بس وہیں ساکت اپنی جگہ پر موجود تھا۔ میں اس لمحے اس قدر ڈر گیا کہ مجھ سے دروازہ تک بند نہ ہو سکا۔

سایے کے دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور اس نے یوسف کی طرف اشارہ کیا۔ یوسف بستر پر آنکھیں بند کیے ہوئے پڑا تھا کہ اچانک اس کا جسم کھسک کر دروازے کی طرف ہونے لگا۔

یوسف چونک اٹھا: ''کون؟''

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں .... سایہ یوسف کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور یوسف دروازے کی طرف ہوئے چلے جا رہا تھا۔

یوسف کے منہ سے بھیانک چیخیں نکلیں اور وہ اپنے ہاتھوں سے بستر کر پکڑنے لگا۔

''نہیں!'' وہ دھاڑا اور مجھے جیسے ہوش آیا۔ میں نے تڑپ کر یوسف کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

''بچاؤ مجھے!'' یوسف روتے ہوئے چلّایا۔

''میرے ہاتھوں کو تھامیے!''

میں نے اسے پکڑے ہوئے بمشکل یہ جملے کہے مگر یوسف میرے ہاتھوں سے پھسل رہا تھا۔ کوئی چیز اسے بری طرح کھینچ رہی تھی، بظاہر میں اسے نہیں دیکھ پا رہا تھا مگر یوسف مستقل کھینچا چلا جا رہا تھا۔ سایہ اس لمحے بدستور اپنی جگہ پر موجود تھا۔ میں آنکھیں بھینچ کر کس کے یوسف کو کھینچنے لگا مگر یوسف میرے ہاتھوں سے نکلا چلا جا رہا تھا۔

''میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا!!....''

یوسف روتے ہوئے چلّایا اور وہ میرے ہاتھوں سے نکلا اور پوری رفتار کے ساتھ برآمدے میں گیا۔

''آہ!!!.... ''یوسف چیختا ہوا کھسکتا چلا گیا۔

''یوسف!.... ''

میں چلّایا اور اس کی طرف دوڑا۔ یوسف پوری رفتار سے فرش پر گھسٹتا ہوا سیڑھیوں تک آیا اور پھر سیڑھیوں سے الٹ کر گرا۔ سایہ اس لمحے غائب ہو چکا تھا۔

''یوسف!.... یوسف!.... ''

میں چلّاتا ہوا اٹھ کر دوڑا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میں زینے کے پاس آیا تو دھک سے رہ گیا۔ یوسف اکمل کے کمرے کے دروازے کے بالکل پاس پڑا ہوا تھا اور خوف سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس بات کا ڈر تھا وہ ہو چکا تھا، یوسف اپنے انجام تک پہنچ ہی چکا تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں روک سکی تھی۔ یوسف آنکھیں پھاڑ کر دروازے کو دیکھتا رہا، کانپتا ہوا جسم اس لمحے بالکل خاموش ہو گیا تھا اور وہ خوف کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''یوسف!!.... ''

میں نے اسے آواز دی اور اس کی طرف دوڑا۔ مگر وہ مجھ سے بے خبر دروازے کو تکے جا رہا تھا۔ جلد ہی میں سیڑھیاں اتر کر اس کی طرف بڑھا اور اسے تھاما۔ یوسف میری بانہوں میں گرا اور سکتے کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی، میں جانتا تھا اس کا دل بند ہو رہا ہے۔

''یوسف!.... یوسف پلیز.... ''میں نے روتے ہوئے کہا مگر وہ دم توڑتا رہا۔

''یوسف پلیز.... مت جاؤ.... مجھے تمھاری ضرورت ہے.... ''

میں نے روتے ہوئے التجا کی مگر وہ دم توڑ گیا۔ اس کا دل بند ہو چکا تھا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی کہانی دم توڑ چکی تھی۔ میں یوسف کی لاش کو سکتے کے عالم میں تکنے لگا۔ اس کی موت کو میں برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور میرا دل خون کے آنسو رونے کے لیے چاہا۔ میں زار و قطار رونے لگا اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''یوسف.... یوسف.... ''

میں اسے لپٹائے ہوئے روتا رہا کہ اچانک اس کا جسم جیسے پھٹ گیا۔اور وہ ریت میں تبدیل ہوگیا۔

میرے چاروں طرف مٹّی ہی مٹّی پھیل گئی۔ میں حیران ہوکر مٹّی کے اس پتلے کو دیکھنے لگا۔ یوسف میری بانہوں میں ایک دم سے بکھر گیا تھا اور اب میرے ہاتھ میں صرف خاک تھی.... صرف خاک....

’’یا اللہ.... یا اللہ!‘‘

میں ہچکیوں سے رونے لگا اور اپنے نصیب کو کوسنے لگا۔ یا خدا یہ میں کس عذاب میں پھنس گیا تھا۔ میں یقیناً جہنم میں تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب ایک ایک کر کے گھر کے بلب اڑنے لگے۔ جلد پورا گھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ گھر کی بجلی جا چکی تھی اور اب میں اندھیرے میں تنہا بیٹھا تھا.... مجھے اندھیرے سے خوف آنے لگا، نجانے اور کتنے ستم مجھ پر باقی تھے کیوں کہ میری گھڑی مجھے بتا رہی تھی کہ میرے چوبیس گھنٹے پورے ہونے میں اب صرف تین گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔

☆......☆

Chapter 6

صبح کے پانچ بج چکے تھے۔شہر بھر میں فجر کی اذانیں گونج رہی تھیں۔کئی لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر مسجد کی طرف بڑھ رہے ہوں گے اوراس کی رحمت اور کرم کا شکرادا کررہے ہوں گے۔مگر میں اس آسیبی اور اندھیرے گھر کے ایک کونے میں بیٹھا ہوااپنے وقت کے پورے ہونے کا انتظار کررہا تھا۔میری آنکھیں اس لمحے پتھرا گئی تھیں اور جسم ساکت تھا، بے جان ہاتھوں میں کلھاڑی لیے بیٹھا بس موت کا انتظار کررہا تھا۔میرے چہرے پر بلا کی مایوسی طاری تھی، یوسف کی موت نے مجھے توڑ دیا تھااور میں ساکت بیٹھا ہوا اپنی موت کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔میں نہیں جانتا تھا کہ اندھیرے میں کب اور کون سی بلا میرے اوپر نازل ہوجائے، لیکن اب جو بھی ہو، میں تیار تھا۔میں مرنے کے لیے تیار تھا۔

خاموشی سے بیٹھا ہوا میں فرش کو تک رہا تھا۔میں جانتا تھا کہ کچھ ہی دیر میں تہ خانے کا وہ سایہ چلتا ہوا میرے پاس آنے والا ہے اور شاید میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مجھے ہمیشہ کے لیے فنا کردے، یا پھر محمد وقاص اور ڈاکٹر عدیل کہیں سے اس گھر میں داخل ہوں گے اور اس بار مجھے خنجر سے قتل کردیں گے۔میں ہر چیز کے لیے تیار تھا۔

اچانک لاؤنج میں رکھا ہوا ٹیلی وژن چل پڑا اور میں نے چونک کر ٹی وی دیکھا۔ٹی وی پر میں نے ایک خوبصورت سے ہوٹل کا منظر دیکھا جہاں ایک بے انتہا خوبصورت کمرہ ہے اور ایک ڈبل بیڈ پڑا ہے۔میں حیران ہوکر ٹی وی دیکھنے لگا، گھر میں بجلی نام کی چیز نہیں تھی مگر ٹی وی باآسانی چل پڑا تھا۔بہرحال میں ٹکٹکی باندھ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔اچانک بستر پر ایک جسم فروش عورت گری

اور ہنستے ہوئے کسی مرد کی طرف دیکھنے لگی۔ عورت اس لمحے برہنہ تھی اور مرد نیم برہنہ تھا۔ عورت اس شخص سے کھیل رہی تھی، وہ کبھی بستر سے اترتی تو دوبارہ بستر پر چڑھ جاتی، جب کہ مرد اسے تھامنے کے لیے بے چین تھا۔ آخر کار مرد نے اسے تھام لیا اور وہ کھلکھلا کر اس کی بانہوں میں آ گئی۔ دونوں اس لمحے ہنس رہے تھے، ایک دوسرے سے پیار کر رہے تھے۔ مرد نے پیار سے اس عورت کو بستر پر لٹایا اور اس کے اوپر آ گیا۔ اب وہ دونوں جنسی محبت میں مشغول ہوئے۔ میں حیران ہو کر یہ منظر دیکھنے لگا۔ مرد عورت کے اوپر لیٹا ہوا تھا اور اسے دیوانوں کی طرح چوم رہا تھا، وہ کون تھا یہ میں ابھی تک نہیں جان پایا تھا، لیکن میں بہت غور سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ عورت کبھی مرد کی کمر پر اپنے ناخن گاڑھ رہی تھی تو کبھی اس کے بالوں کو پکڑ رہی تھی۔ دونوں جنسی محبت میں اس لمحے دیوانے ہو گئے۔

ایسے میں مرد نے عورت کو اپنے اوپر لیا اور اس کی زلفیں مرد کے چہرے پر چھا گئیں۔ میں الجھن کے عالم میں دیکھتا گیا، آخر یہ مرد کون تھا اور اس منظر کا یہاں کیا کام؟ میں حیران تھا۔ مرد اب بے قابو ہو چکا تھا اور اپنا چہرہ عورت کے پستان میں چھپائے جا رہا تھا۔ عورت نے اپنی زلفوں کو جھٹکا اور مرد کا چہرہ نظر آیا۔ جو چہرہ مجھے نظر آیا اسے دیکھنے کی مجھے ایک فیصد بھی امید نہ تھی اور میں سکتے کے عالم میں یہ منظر دیکھنے لگا۔ وہ مرد کوئی اور نہیں بلکہ ..... میں خود تھا۔

میرے سامنے میرے ماضی کا ایک بھیانک گناہ چل رہا تھا، میری روح کانپنے لگی۔ یہ میری زندگی کے وہ لمحے تھے جنہیں میں فراموش کر دینا چاہتا تھا، جن کا ذکر اگر کوئی سن لے تو مجھے سماج میں کوئی مقام نہ ملتا، مگر میرے سامنے میرے ہی گناہوں کی وڈیو فلم چل رہی تھی اور میں حیران ہو کر اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا اور غصے سے میری گردن کی رگیں پھولنے پچکنے لگیں۔

کلھاڑی کو کس کے تھامے ہوئے ٹی وی کے پاس چلا۔ میں نے کلھاڑی کو اٹھایا اور بے انتہا رفتار سے ٹی وی پر دے مارا۔

ٹیوی اسکرین چھناکے سے ٹوٹی اور اس کے دو ٹکڑے الگ ہو کر گرے۔ میں پاگلوں کی طرح ٹیوی پر کلھاڑی برسانے لگا اور اس کو توڑ کر چکنا چور کر دیا۔

''حرامزادو۔ سامنے آؤ۔ ہیجڑوں کی طرح منہ چھپا کر کیا بیٹھے ہو۔ ایک بار۔۔ صرف ایک

بار میرے سامنے آؤ۔''

میں چلّا چلّا کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر مجھے کوئی جواب نہ آیا۔ اس لمحے میرے سر پر خون سوار ہو چکا تھا، اب میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون جوش مار رہا تھا اور میرا خوف نکل چکا تھا۔ مجھے پروا نہ تھی کہ میرے سامنے کوئی آسیب ہو یا انسان.... مجھے بس خون کرنا تھا۔

''حرامیوں کیا حجرے میں چھپ کر بیٹھے ہو۔ ہمّت ہے تو سامنے آؤ!''

میں اب پاگلوں کی طرح چلّا رہا تھا اور کلھاڑی ہر طرف برسانے لگا۔ میرے آگے جو کچھ بھی آ رہا تھا وہ صرف میری کلھاڑی کا شکار ہو رہا تھا۔ مجھے مقابلہ کرنا تھا.... میں پاگل ہو رہا تھا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور میں جنگلیوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک تہ خانے کا دروازہ خود بہ خود کھل گیا۔

میں دھک سے رہ گیا، جس تہ خانے کو میں نے اچھی طرح بند کیا تھا وہ خود بہ خود کیسے کھل سکتا تھا۔ سکتے کے عالم میں پلٹ کر دیکھا تو دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ تکنے لگا، مجھے تہ خانے میں سے ہلکی ہلکی روشنی آتی نظر آ رہی تھی، اندر کچھ لوگ موجود تھے جو باتیں کر رہے تھے۔ وہ کیا کہہ رہے تھے یہ تو میری سمجھ نہیں آ رہا تھا مگر اتنا مجھے احساس تھا کہ تہ خانے کے اندر کوئی موجود ہے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ تہ خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا ایک ایک قدم مجھے تہ خانے کے پاس لے جا رہا تھا۔ میرا دل اتنی ہی تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ آخرکار میں تہ خانے کے دروازے پر پہنچا اور نیچے جھانکنے لگا تو باتوں کی آواز مزید صاف ہوگئی مگر الفاظ ابھی بھی دبے دبے تھے۔ میں نے سرد آہ لی اور کلھاڑی پکڑ کر نیچے جانے لگا۔ ایک ایک قدم میں بہت احتیاط سے رکھ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے قدموں کی آواز ان تک چلی جائے۔ جب میں پانچویں سیڑھی پر پہنچا تو مجھے آواز صاف آنے لگی۔ یہ دو نوجوان لڑکوں کی آوازیں تھیں جو اپنی ہی دھن میں مگن تھے۔

''ماشاءاللہ اس قدر بکواس Basement میں نے آج تک نہیں دیکھا۔''

ایک لڑکا منہ بنا کر بولا۔

''ویسے ندیم، بچّی کے ساتھ مزے کرنے کے لیے یہ بیس منٹ کوئی بُری جگہ نہیں ہے۔''

ایک لڑکا ہنس کر بولا۔

’’سلیم جب ہم شرط جیتیں گے تو کسی بیس منٹ میں نہیں ہوٹل میں جائیں گے پیارے۔‘‘
پہلے لڑکے نے ہنس کر جواب دیا اور میں سمجھ گیا میرے سامنے اس گھر میں داخل ہونے والے دو بھائی سلیم اور ندیم تھے۔اس گھر کے چوتھے اور پانچویں شکار۔

’’سلیم ذرا فون تو لگا عاصم کو۔اس کو بتائیں تو سہی کہ ہم اب تک تو باخیریت موجود ہیں یہاں پر۔کوئی مائیکل جیکسن کی طرح ناچ نہیں رہے!.....‘‘ ندیم نے ہنس کر کہا۔

’’ہاں ایک سیکنڈ.....‘‘

سلیم نے اطمینان سے یہ جملے کہے اور اپنا موبائل فون نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔جلد ہی سلسلہ مل گیا اور وہ بولا:

’’میرے لعل بچّی تیار ہے نا؟ابے حرامی ہم اب تک تو کیا ساری زندگی زندہ رہیں گے.... تو بہت بری طرح ہارنے والا ہے....ہاہاہا.... چل چل.... بدمعاشی کسی اور کو دکھانا.... یہ لو ندیم سے بات کرو....‘‘

یہ کہہ کر سلیم نے فون ندیم کو دیا۔ندیم نے موبائل لیا اور کان سے لگایا:

’’ہاں میرے ہونے والے سالے....ہاں.... نہیں اب تک تو کوئی عجیب بات نہیں ہوئی ہے....لوگ افواہیں بھی بہت پھیلاتے ہیں یار.... گھر کی زمین ہتھیانے کے لیے اسے آسیب زدہ بنا دیا....اصل میں تھا کچھ بھی نہیں....لوگ اس لیے یقین کرتے ہیں کیوں کہ لوگ ڈرتے ہیں....اگر بہادری سے ہر چیز کا سامنا کیا جائے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوتے دیر نہیں لگتی....یہ اور بات ہے کہ دودھ آج کل کافی مہنگا ہو گیا ہے....ہاہاہا....ہاہاہاہا....یہ بتاؤ میری جان نادیہ کیسی ہے؟اسے بولو دولھا بھائی بس جلد ہی آنے والے ہیں۔۔ساتھ میں منہ دکھائی بھی لائیں گے.... منہ دکھائی میں ایک خون آلود کلھاڑی پڑی تھی یہاں پر وہی دکھا دوں گا اسے.... اب نجانے کہاں ہے....ہاں ہاں تم بے فکر رہو.... کچھ نہیں ہوگا ہمیں....چلو اب میں فون بند کرتا ہوں۔ملتے ہیں کچھ دیر بعد....اوکے بائے۔‘‘

یہ کہہ کر ندیم نے سلسلہ ختم کر دیا اور جیب سے سگریٹ نکالی۔

’’بھائی کیا تم میرے لیے ایک کام نہیں کر سکتے؟‘‘ سلیم نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

’’بول۔‘‘ ندیم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

''بھائی کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ شرط پوری ہوجانے کے بعد تم نادیہ کے ساتھ کچھ نہ کرو؟''
سلیم نے جھجک کر پوچھا۔

''کیوں؟'' ندیم نے چونک کر پوچھا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ... I love her۔'' سلیم نے گھبرا کر اقبال محبت کیا۔

"Are you mad, she's a slut. do you want some slut to be in your home forever" ندیم نے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے پوچھا۔

''یار وہ حالات کا شکار ہے بس، اور کچھ نہیں۔'' سلیم نے جھینپ کر کہا۔

''حالات کا شکار ہے تو ہم اس کے حالات ہیں، بس تو اسے ہمارا شکار ہونے دو....''

ندیم نے مسکرا کر یہ جملے کہے اور لبوں سے دھواں چھوڑا اور پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا تو اچھل پڑا۔

اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

''سلیم! وہ کون ہے؟'' ندیم نے دھاڑ کر پوچھا۔

''کون؟''

سلیم نے بھی پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا اور اچھل پڑا۔ دونوں بھائیوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس لمحے مجھے بھی خوف ہوا اور میں پلٹ کر اوپر بھاگا۔

''پکڑو اسے سلیم۔ پکڑو!''

ندیم چلّایا اور سلیم میرے پیچھے دوڑا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر گھر میں داخل ہوا اور دروازہ بند کرنے لگا مگر سلیم نے اپنی ٹانگ اور ہاتھ دروازے میں پھنسا لیے۔

''آہ!!.... آہ!!....''

میرے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں اور میں زور لگانے لگا۔

''بھائی جلدی اوپر آؤ!!....''

سلیم نے بھی دروازے پر زور لگاتے ہوئے اپنے بھائی کو پکارا۔ جلد ہی ندیم اوپر پہنچا اور اس نے سلیم کے ساتھ مل کر دھکّا دینا شروع کیا۔ دونوں کا زور مجھ سے کہیں زیادہ تھا اس لیے دروازہ کھلتا چلا گیا اور سلیم گھر میں داخل ہوا۔ میں گھبرا کر پیچھے ہوا اور اپنی کلھاڑی کو سنبھالنے لگا مگر

عین اسی وقت ندیم نے ایک مکا میرے منہ پر جڑ دیا۔ میں الٹ کر گرا اور کلھاڑی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔

''اسے باندھ دو..... جلدی۔''

ندیم نے چلّا کر کہا اور سلیم کچن کی طرف بڑھا۔ اس لمحے سورج آسمان پر طلوع ہو چکا تھا اور گھر میں سورج کی روشنی داخل ہو رہی تھی۔ ندیم کے مکے کی وجہ سے میرے منہ سے خون بہنے لگا۔ سلیم رسّی لے کر آیا اور میرے ہاتھ لاؤنج کی کھڑکی سے باندھنے لگا۔ اس لمحے ندیم نے کلھاڑی اٹھائی اور میری گردن پر رکھ کر بولا:

''کون ہو تم؟ اور اس گھر میں کیسے داخل ہوئے؟''

اس کے پوچھنے پر میں نے کوئی جواب نہ دیا، بس خون تھوکنے لگا۔

''جواب دے سالے!''

سلیم نے چلّا کر پوچھا اور کس کے لات میرے منہ پر ماری۔ میرا جبڑا ہل گیا اور گال پھٹ گیا، خون اب میرے چہرے پر پھیل چکا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔

''اس کا حال تو دیکھو.....''

ندیم نے گھن کھائے ہوئے لہجے میں یہ جملے کہے اور سلیم نے بغور مجھے دیکھا۔ میں خون میں لت پت، زخمی اور بے انتہا تھکا ہوا تھا، جو بھی مجھے اس حال میں پہلی مرتبہ دیکھتا مجھ سے خوف ضرور کھاتا۔

''یہ تو کوئی بہت ہی عجیب آدمی لگ رہا ہے۔'' سلیم نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں ہوگا عجیب آدمی، دراصل گھر میں داخل ہونے والے ہر شخص کا قتل یہی تو کرتا ہے، وہ یہی شخص ہے، جس نے ایک ایک انسان کا خون کیا ہے۔'' ندیم نے میرا منہ پکڑ کر کہا۔

''اگر ہم اسے صحیح وقت پر نہ پکڑ لیتے تو شاید ہم بھی مر چکے ہوتے، کسی زہریلی گیس کے ذریعے ہمارے دل بند ہو جاتے اور ہماری موت کو لوگ آسیب کا شکار سمجھتے۔''

ندیم نے دانت پیس کر کہا۔

"What the fuck"۔ سلیم کے منہ سے حیرت میں نکلا۔

''بول حرامزادے..... کون ہے تو؟ اور کس نے بھیجا ہے تجھے اس گھر میں؟''

ندیم نے میرے بال کھینچ کر مجھ سے پوچھا۔ مجھے اس لمحے ان دونوں لڑکوں سے بے انتہا نفرت محسوس ہورہی تھی، اور کچھ دیر بعد ہی یہ دونوں ایک بھیانک موت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گلے لگانے والے تھے، یہ سوچ کر میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ ندیم اور سلیم مجھے اس طرح ہنستے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گئے، ایک شخص جو کہ نیم زخمی ہو اور خون میں نہایا ہوا ہو اس کا اس عجیب طرح ہنسنا واقعی دل دہلانے کے لیے کافی تھا۔ خون میرے چہرے پر بہہ رہا تھا، میرے دانت بھی اس وقت سرخ ہو چکے تھے۔

''تم دونوں مروگے..... بہت جلد تم دونوں مروگے۔''

میں نے ہنستے ہوئے یہ جملے کہے اور دونوں حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔

''اس گھر میں کوئی بھی چوبیس گھنٹے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکا، جو داخل ہوا مرتا ضرور ہے۔ تم بھی مروگے، تم بھی مروگے۔'' میں نے آنکھیں پھیلا کر یہ جملے کہے اور دیوانوں کی طرح ہنسنے لگا۔

"Shut the fuck up"۔ سلیم دھاڑا اور میرے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔

میں ایک بار پھر تکلیف کو سہہ گیا....

''سلیم.... دروازے چیک کرو، مجھے لگتا ہے اس کے کوئی اور ساتھی بھی یہاں موجود ہیں۔''

ندیم نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

''اوکے....''

سلیم کے منہ سے نکلا اور دروازوں کی طرف دوڑ پڑا۔ ندیم اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھا اور مجھے دیکھنے لگا۔ میں بھی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ندیم نے کچھ پل کے لیے مجھے دیکھا اور کہا:

''تم.... تم روحیل ہو.... اس گھر کے مالک؟''

اس کے یہ پوچھنے پر میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''میں نے تمھاری بیڈروم میں تمھاری تصویر دیکھی ہے، بیوی بچّوں کے ساتھ تمھاری ایک تصویر اوپر موجود ہے۔ تمھارا بچّہ بہت کیوٹ تھا۔'' ندیم نے مجھے دیکھتے ہوئے یہ بات کہی اور میں نظر جھکا گیا۔

’’تم یہ سب کیوں کررہے ہو؟ کیوں لوگوں کا خون کرتے پھر رہے ہو؟ کیا مل رہا ہے تمھیں؟‘‘ ندیم نے حیران ہوکر پوچھا۔

اس کی بات سن کر میں نے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر نظروں کو جھکا کر جواب دیا:

’’میں کسی کا خون نہیں کر رہا.... بلکہ میں تو خود اس گھر کا ایک شکار ہوں.... تم میں اور مجھ میں کچھ خاص فرق نہیں.... بس اتنا سا فرق ہے کہ تمھارے چوبیس گھنٹے پورے ہو چکے ہیں.... جبکہ میرے چوبیس گھنٹے ابھی باقی ہیں۔‘‘

’’اگر ہمارے چوبیس گھنٹے پورے ہو گئے تو ہم مرے کیوں نہیں؟‘‘

ندیم نے مسکرا کر پوچھا۔

’’تم مر چکے ہو، تم اس وقت اپنے جسم میں نہیں.... بلکہ روح میں تبدیل ہو چکے ہو.... تم اب ہر روز اسی طرح مرتے رہو گے.... قیامت تک....‘‘

میں نے نفرت کے عالم میں یہ جملے کہے اور ندیم ہنس کر مجھے دیکھنے لگا۔ شاید اسے میری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے کلہاڑی میرے سرہانے رکھی:

"Listen to me you son of a bitch۔ تم ایک دماغی مریض ہو اور تمھیں ایک سائیکی ٹرسٹ کی ضرورت ہے....‘‘

’’کم اون!!....‘‘ میں ہنس کر بولا اور کہنے لگا:

’’سائیکی ٹرسٹ کے چوبیس گھنٹے کب کے پورے ہو چکے ہیں اور وہ میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ کر مرا تھا۔ جو بیماری مجھے ہے وہ تم سب کو بھی ہے.... اور اس بیماری کا کوئی حل نہیں You won’t kill it.you won't stop it. it will kill you. it will surely kill you after 24 hours۔ بس دیکھتے جاؤ۔‘‘

میرے کہنے پر ندیم غور سے مجھے دیکھنے لگا۔ ایسے میں سلیم آیا اور خوف زدہ ہو کر بولا:

’’بھائی کوئی دروازہ نہیں کھل رہا ہے، لگتا ہے سب کے سب جام ہو گئے ہیں۔‘‘

اس کی بات سن کر ندیم نے میری طرف دیکھا تو میں ان دونوں کی طرف ہی دیکھتا ہوا نظر آیا۔

’’’سلیم.... ہمیں یہاں آئے ہوئے کتنی دیر ہو چکی ہے؟‘‘

ندیم نے مجھے دیکھتے ہوئے سلیم سے پوچھا۔

''ایک دن تو ہو گیا ہے۔''سلیم نے الجھ کر جواب دیا۔

''مجھے صحیح وقت بتاؤ،ایک ایک سیکنڈ کے بارے میں بتاؤ۔''ندیم نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

''اہمم.... تئیس گھنٹے،اٹھاون منٹ اور تیس سیکنڈ۔''سلیم نے گڑبڑا کر بتایا۔

''اس کم مطلب ہمارے پاس ڈیڑھ منٹ ہے۔''ندیم بڑبڑایا اور میری طرف دیکھ کر بولا:

''ٹھیک ہے۔۔ٹھیک ڈیڑھ منٹ بعد چوبیس گھنٹے پورے ہونے والے ہیں.... دیکھتے ہیں کہ ہمیں موت کدھر سے اور کہاں سے آتی ہے۔''

''موت کہیں سے نہیں آئے گی....بس میرے بیٹے کے کمرے کے دروازے کو دیکھو.... تم خود بہ خود دوسرے جہاں پہنچ جاؤ گے۔''

میں نے اطمینان سے یہ بات کہی اور ندیم نے پلٹ کر اکمل کے دروازے کی طرف دیکھا۔ سلیم بھی خوف زدہ ہو کر دروازے کو دیکھنے لگا۔ندیم مسکرایا اور پلٹ کر بولا:

''یہ دروازہ تو خراب ہے۔''

''موت کو آنے کے لیے دروازوں کو کھولنا نہیں پڑتا ندیم،تم کہیں بھی جا کر چھپ جاؤ،موت تمھیں آ کر رہے گی۔''میں نے سفّاک لہجے میں کہا۔

"Okay, let's see then"۔

ندیم نے مسکرا کر یہ جملے کہے اور دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔سلیم بھی دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا مگر خوف زدہ ہو کر۔ندیم کے جیسی بہادری اس میں نہیں تھی۔آخر کار چوبیس گھنٹے پورے ہونے میں صرف تیس سیکنڈ رہ گئے اور دونوں بھائی دروازے کو تکنے لگے۔خود میں بھی دروازے کو تک رہا تھا،میں بھی یہ جاننے کے لیے مچل رہا تھا کہ آخر اس دروازے میں ایسا ہے کیا جسے دیکھ کر ہر کوئی موت کو گلے لگا لیتا ہے۔آخر کار تیس سیکنڈ کچھ سیکنڈ میں تبدیل ہوئے....اور جلد ہی تین،دو،ایک اور صفر۔

ندیم اور سلیم کے چوبیس گھنٹے پورے ہو چکے تھے اور وہ دروازے کو دیکھنے لگے،مگر کچھ نہ ہوا۔دروازہ ساکت اپنی جگہ رکا رہا۔دونوں بھائیوں نے کچھ دیر اور انتظار کیا مگر کچھ نہ ہوا۔میں بھی حیران ہو کر یہ منظر دیکھنے لگا۔ندیم نے مسکرا کر سلیم کو دیکھا اور پلٹ کر مجھے۔میرے پاس اس

لمحے کہنے کے لیے کچھ نہ تھا، میں بس خاموش رہا۔

''بس؟ یا اور بھی کچھ بکواس کرنی ہے تم نے؟''

ندیم نے طنز کیا مگر میں خاموش رہا۔

ندیم نے مسکرا کر گردن کو جھٹکا:

''سلیم .... چلو نکل چلیں یہاں سے .... ہم شرط جیت گئے ہیں، اسے پولیس کے حوالے....''

ندیم کے الفاظ ادھورے رہ گئے کیوں کہ سلیم کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ ندیم نے جو پلٹ کر اسے دیکھا تو اس کی آنکھیں خوف کی زیادتی سے پھٹی ہوئی نظر آئیں اور ہاتھ پاؤں کپکپاتے ہوئے نظر آئے۔ اس کی آنکھیں مستقل اس خونی دروازے کی طرف تھیں۔ ندیم حیران رہ گیا اور پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا تو اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی!

ندیم کا چیخنا تھا کہ وہ گر پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں حیران ہو کر یہ منظر دیکھ رہا تھا، کیوں کہ نہ تو دروازہ اپنی جگہ سے ہلا تھا اور نہ ہی کوئی چیز مجھے نظر آ رہی تھی، مگر کچھ تھا جو ندیم اور سلیم بہ خوبی دیکھ رہے تھے۔ سلیم لڑکھڑاتے ہوئے پیروں سے تہ خانے کی طرف بھاگا۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں موت کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ تہ خانے کا دروازہ کھول کر وہ نیچے جانے لگا مگر تب ہی اس کا پاؤں سلپ ہوا اور وہ نیچے گرتا چلا گیا۔ میں سمجھ گیا تھا، سلیم کا پاؤں سلپ نہیں بلکہ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ یہ سمجھ کر میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی اور میں پلٹ کر ندیم کی طرف دیکھنے لگا تو وہ بھی دم توڑتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑ رہے تھے اور منہ سے جھاگ نکلنے لگی تھی۔ ندیم کا سانس رک چکا تھا اور وہ بھی اس قاتل کمرے کا شکار ہو گیا۔ وہ مر چکا تھا۔

میں نے سر دیوار سے لگایا اور آنکھیں بند کر کے ہنسنے لگا، کچھ ہی پل میں میری ہنسی قہقہے میں تبدیل ہوئی اور اب میں چیخ چیخ کے قہقہے لگا رہا تھا....

اور پھر میں دیوانوں کی طرح تالیاں بجانے لگا۔ سلیم اور ندیم کے قتل نے مزہ دوبالا کر دیا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہنسنے لگا۔ زبان باہر نکال کر قہقہے لگانے لگا!!.... گھر کے در و دیوار،

ساز و سامان میری اس دیوانگی کو تک رہے تھے.... ندیم اور سلیم کی لاشیں میرے سامنے پڑی ہوئی تھیں.... لیکن میں ہنسے جا رہا تھا.... ہنسے جا رہا تھا۔

ہنس ہنس کے جب میرا گلا خشک ہوا.... تو نجانے کیسے آنکھیں بھیگ گئیں....اور میری ہنسی رونے میں تبدیل ہوئی.... ایک ہی پل میں اب میں ہچکیوں سے رو رہا تھا....۔اس قدر خوفناک اموات دیکھ کر میری روح پر کیا گزر رہی تھی وہ میں ہی جانتا تھا۔ میں اس لمحے دوزخ میں تھا، صرف دوزخ میں۔ یہ سوچ کر میں زاروقطار رونے لگا اور میری آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ میں اپنے حال پر اکیلا ماتم کر رہا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ میرے اوپر کیا گزر رہی ہے۔ میرے سامنے ندیم کی لاش تھی اور اس کی آنکھیں ابھی تک کھلی پڑی تھیں۔ میں روتے ہوئے اسے دیکھنے لگا کہ میری نظر کلھاڑی پر پڑی۔ میں نے آنسو صاف کیے اور کلھاڑی کی طرف پیر بڑھایا۔کلھاڑی زیادہ دور نہیں تھی اور جلد ہی میرے پیر کا پنجہ اس تک پہنچ گیا۔ میں اسے کھسکا کھسکا کر اپنے بائیں ہاتھ کے قریب کرنے لگا۔ کچھ دیر کی محنت کارآمد رہی اور میرے بائیں ہاتھ میں کلھاڑی آ گئی۔ میں نے کلھاڑی کو تھاما اور رسّی پر پھیرنے لگا۔ یہ کام خاصا مشکل تھا مگر مجھے جیسے تیسے کر کے ان رسّیوں سے آزاد ہونا تھا۔ آخر کار دس منٹ کی کوشش کے بعد رسّی کٹ گئی اور میرے ہاتھ کھل گئے۔ میں اپنے ہاتھوں کو پکڑ کر سہلانے لگا۔ میری نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر پڑی۔ میں نے صاف صاف گھڑی کے اوپر لکھا ہوا دیکھا:

00:57:17

میرا وقت پورا ہونے میں ایک گھنٹے سے بھی کم کا وقت بچا تھا۔

☆......☆

Chapter 7

سورج طلوع ہو چکا تھا اور Street 12 سورج کی روشنی سے روشن تھی۔ مگر سورج کی روشنی نے بھی اس سڑک اور گھر کے سنّاٹے کو ختم نہ کیا۔ وہی گہرا سنّاٹا ہر طرف چھایا ہوا، وہی گہری خاموشی۔ میں سر جھکائے صوفے پر بیٹھا ہوا اپنے وقت کے پورے ہونے کا انتظار کر رہا تھا، میں جانتا تھا کہ اگلے پچاس منٹ بعد میری موت ہونے والی ہے اور میں اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جس قدر میں اس موت سے لڑنے کی کوشش کرتا اس قدر بدترین موت مجھے نصیب ہوتی۔ اس لیے میں خاموشی سے اپنے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرا جبڑا ہل گیا تھا اور مجھے بے انتہا تکلیف تھی۔ میرے گال اور ماتھے سے خون رس رہا تھا۔ کسی بھی لمحے میں اس دنیا سے رخصت ہونے والا تھا۔

اچانک میرے کانوں میں عجیب سی کلک کلک سی آوازیں آنے لگیں۔ ایسا لگا جیسے کوئی چھوٹی سی نوکیلی چیز دیواروں پر چل رہی ہو۔

میں نے مردہ نگاہیں اٹھا کر دیواروں پر دیکھا تو یہ دیکھ کر میں دھک سے رہ گیا کہ دیواروں پر خود بہ خود انگریزی کے وہ حروف ابھر رہے تھے۔ گھر کی اب کوئی ایسی جگہ نہ بچی تھی جہاں یہ حروف نہ لکھے ہوں۔ زینہ، دیوار، چھت، زمین، دروازے، روشن دان، صوفے، مسہری گویا ہر طرف یہ الفاظ ابھر رہے تھے اور میں پاگلوں کی طرح یہ الفاظ پڑھنے لگا۔

میں اپنے بال کھینچنے لگا۔ میری زبان باہر آ رہی تھی اور میری آنکھیں بھینگی پڑھ رہی تھیں، میں پاگل ہو رہا ہوں.... میں پاگل ہو رہا ہوں.... میں پاگل ہو رہا ہوں.... ہاں میں پاگل ہو رہا ہوں.... میں ایک وحشی ہوں.... میں ایک پاگل ہوں.... یہ الفاظ بار بار میرے ذہن میں گونجنے

لگے اور میں پاگلوں کی طرح ان الفاظ کو گھورنے لگا۔ میرے دماغ کی رگ جیسے پھٹنے والی تھی اور میرا دل بند ہوکر رہ جاتا۔ میں اپنے سر کے بالوں کو پکڑ کر کھینچنے لگا کہ مجھے کسی کی سسکیوں کی آواز آئی۔ میں چونک کر دوسری منزل کی طرف دیکھنے لگا۔ رونے کی آواز اوپر والی منزل سے آرہی تھیں۔ دوپل کے لیے میں ٹکٹکی باندھ کر اوپر دیکھنے لگا اور پھر اوپر کی طرف قدم اٹھائے۔ میں ایک ایک کر کے سیڑھی چڑھتا چلا گیا اور اوپر کی منزل میں پہنچا۔ سامنے اپنا بیڈروم دیکھا تو رونے کی آوازیں وہیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں چل پڑا اور اپنے کمرے کے قریب ہونے لگا۔ میرا ایک ایک قدم مجھے کمرے کی طرف قریب کرنے لگا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ چلتا رہا۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے صاف دیکھا صبا زخمی حالت میں رو رہی تھی۔ میں اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے پلٹی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ میں حیران ہوکر اسے دیکھ رہا تھا، میرے اوپر اس لمحے جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

ایسے میں اس کے لب ہلے:

''کیوں؟ آخر کیوں؟ کیوں تم نے مجھے دھوکا دیا؟ کیوں تم نے میری محبت کا مذاق اڑایا.... کیوں تم نے میری محبت کو نیلام کر دیا.... کیا میری محبت میں کوئی کمی تھی جو تم اس طوائف کے ساتھ.... وہ تو محض تمھاری سیکریٹری تھی!''

صبا نے روتے ہوئے اپنی شکایتیں جاری رکھیں اور میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔

''تم نے اپنی ساری جمع پونجی.... اپنی رکھیل پر لگادی.... میرا تو تمھیں خیال رہا ہی نہیں.... لیکن اب تو تمھیں ہمارے معصوم اکمل کا بھی خیال نہیں رہا....اور تم اپنی ساری جمع پونجی اس رکھیل کے اوپر لگا رہے ہو؟ تم نہیں جانتے کہ تم کس طرف بڑھ رہے ہو.... اس راستے پر مت چلو.... کیوں کہ اس رستے پر چلو گے تو نہ تمھیں دنیا میں جگہ ملے گی.... نہ آخرت میں۔''

صبا نے روتے ہوئے یہ جملے کہے اور میں سکتے کے عالم میں اس کو دیکھتا رہا۔ صبا روتے ہوئے بولی:

''اگر آج وہ ہوٹل کی وڈیو میں نہ دیکھتی.... تو نجانے کتنے اور دن پاگل بنتی رہتی.... مگر اب میں سب کچھ سمجھ چکی ہوں....اور مجھے اپنے بچّے کے لیے صحیح فیصلہ کرنا ہوگا.... روحیل.... میں تم سے خلع لے رہی ہوں....''

صبا نے روتے ہوئے یہ الفاظ کہے اور میرا سر جھک گیا۔ اس نے صحیح فیصلہ کیا تھا، مجھ جیسے بدذات کو چھوڑ دینے میں ہی بھلائی تھی۔ بوجھل قدموں سے میں واپس پلٹ گیا اور سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔ میرا دل اس وقت ختم ہو چکا تھا اور اب میری پہلی خواہش یہی تھی کہ میں اپنی جان دوں۔ میں خاموشی سے سیڑھیاں اترتا رہا.... ایک ایک سیڑھی.... ہلکے.... ہلکے.... کہ اچانک گھر کا مرکزی دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ میں نے چونک کر جو اس شخص کی طرف دیکھا تو اچھل پڑا۔ میرے سامنے کوئی اور نہیں بلکہ مسٹر جمیل موجود تھا، جو چاروں طرف گھر پر نظر دوڑا رہا تھا۔

اس گھر کا چھٹا شکار.... مسٹر جمیل۔

☆......☆

مسٹر جمیل نے چشمہ لگایا ہوا تھا اور گھری مونچھوں سے لب ڈھکے تھے۔ ماتھے سے سر گنجا ہو گیا تھا اور چہرے پر جھرّیاں تھیں۔ سرمئی رنگ کی پتلون اور سفید قمیض پہنے ہوئے یہ شخص دور سے ہی صحافی معلوم ہو رہا تھا۔ مسٹر جمیل چلتا ہوا گھر کے لاؤنج میں آیا اور ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ لاؤنج میں ابھی تک ندیم کی لاش پڑی ہوئی تھی، جگہ جگہ خون بکھرا ہوا تھا اور دیواروں پر انگریزی حروف ابھی بھی نمایاں تھے، مگر شاید مسٹر جمیل ان سب چیزوں سے بے خبر تھا۔ اسے لاؤنج کا منظر وہ نہیں نظر آ رہا تھا جو میں دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مجھے بھی نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ میں سیڑھیوں پر کھڑا خاموشی سے جمیل کو دیکھنے لگا۔ جمیل چلتا ہوا آیا اور ہر چیز کو بغور دیکھتا رہا۔ صوفے کے پاس آ کر اس نے صوفے کو ہاتھ سے چیک کیا اور پھر اطمینان سے اس پر بیٹھ گیا۔ چشمہ اتار کر ٹیبل پر رکھا اور جیب سے پرانا سا موبائل فون نکال کر کسی کے نمبر ملائے۔ میں خاموشی سے اسے یہ عمل کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جلد ہی جمیل کا سلسلہ مل گیا:

''ہیلو؟ ہاں رباب؟ ہاں میں گھر پر آ گیا ہوں.... ابھی تک باخیریت ہوں.... تم بس دعا کرو کہ سب کچھ ٹھیک رہے.... سنو میں نے ناظم سے بات کر لی تھی، انہوں نے کہا ہے کہ دن ڈھلنے سے قبل وہ پچاس ہزار روپے تمھیں دے دیں گے تم ان سے جا کر پیسے وصول کر لینا اور مارکیٹ سے سموسے، جلیبی اور پیپسی کی بڑی بوتل لے کر گھر جانا.... بچّوں کی بھوک مجھ سے دیکھی نہیں جاتی رباب۔''

یہ کہہ کر جمیل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
میرا دل بھی پھٹنے لگا اور میں خاموشی سے جمیل کو تکتا رہا۔
''تم نے کچھ کھایا؟ کچھ کھا لو رباب.... کب تک پانی پر گزارا کرتی رہو گی؟ دیکھو جب تک میں زندہ ہوں تم لوگوں کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے.... ہاں.... ہاں مجھے کچھ نہیں ہوگا.... یہ میرا وعدہ ہے تم سے.... میں اس گھر سے زندہ نکلوں گا.... میں نے اپنے پاس قران مجید اور کئی دعائیں رکھی ہوئی ہیں.... تم دیکھنا میں اس گھر سے زندہ نکلوں گا.... مولا علیؑ کے صدقے میں مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ چلو میں فون رکھتا ہوں.... اپنا خیال رکھنا.... خدا حافظ....''
یہ کہہ کر اس نے سلسلہ ختم کر دیا۔ میں خاموشی سے اسے تکتا رہا، مسٹر جمیل واقعی ایک شریف سا انسان تھا اور نیک مقصد کے تحت اس گھر میں داخل ہوا تھا، مگر انجام اس کا بھی وہی تھا جو باقی سب کا ہوا۔ جمیل اٹھا اور چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میں سیڑھیوں پر خاموشی سے ایک طرف ہو گیا اور اسے جگہ دی۔ وہ میرے پاس سے گزرتا ہوا چلا گیا۔ مسٹر جمیل میری موجودگی سے ابھی تک بے خبر تھا۔ بہرحال وہ خاموشی سے چلتا ہوا دوسری منزل پر گیا اور اطمینان بخش طریقے سے میرے کمرے کی طرف بڑھا۔ میں اسے جاتے ہوئے تکتا رہا۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر لیا، شاید وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا....
میں نے خاموشی سے فرش کو تکا اور سوچنے لگا، کہ کس قدر معصوم لوگوں کو یہ گھر اپنا شکار بنا گیا ہے۔ نجانے اس سارے عمل کے پیچھے کیا مقصد تھا، کیا یہ بلا کبھی رک بھی سکتی تھی؟ کیا یہ آسیب کبھی مر سکتا تھا؟ میں نہیں جانتا۔ گردن پر ہاتھ پھیر کر میں باتھ روم کی طرف بڑھا۔ میرا جسم اور میرا چہرہ اس وقت خون میں لت پت پڑا تھا، مجھے پانی سے اپنا بدن اور اپنا چہرہ صاف کرنا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے باتھ روم کی طرف قدم بڑھا دیے۔ میں باتھ روم میں داخل ہوا تو دیکھا فرش، دیوار، ٹب، واش بیسن، ہر طرف انگریزی کے وہی حروف لکھے ہوئے ہیں۔ میں خاموشی سے واش بیسن کی طرف بڑھا اور پانی کا نل کھولا، گرم پانی نل سے بہنے لگا۔ میں نے پانی کو چلّو میں بھر کر اپنے چہرے پر ڈالا اور چہرہ اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔ میرا چہرہ اب ویسا نہیں رہا تھا جیسا اس گھر میں داخل ہوتے وقت تھا۔ میرا چہرہ اب مردہ ہو چکا تھا اور میرے اندر اب جینے کی کوئی لگن نہ تھی۔ میں خاموشی سے اپنا چہرہ تکتا رہا کہ اچانک میری نظر آئینے پر پڑی۔ آئینے میں مجھے پچھلی دیوار کا عکس

اورانگریزی کے حروف لکھے ہوئے نظر آئے، مگر آئینے کی وجہ سے انگریزی حروف مجھے پلٹے ہوئے نظر آئے۔ پہلے یہ حروف ساتھ میں ملانے سے کچھ اس طرح بنتے تھے: Redrum fo Sterces مگر اب یہ کچھ مطلب نکال رہے تھے، اور میں غور سے یہ الفاظ پڑھ رہا تھا:

"Murder of Secrets"

"Secrets of Murder"

میرے منہ سے سکتے کے عالم میں نکلا.... الفاظ کا راز بالآخر میں نے جان لیا تھا۔ ان الفاظ کا مطلب رازوں کا قتل تھا.... مطلب یہاں بات کسی قتل کی ہو رہی تھی۔ یہ پتا چلنا تھا کہ میرے جسم کا خون جیسے خشک ہو کر رہ گیا، اس گھر میں دو ہی انسانوں کے قتل ہوئے تھے اور وہ انسان میری بیوی اور میرا بچّہ تھا۔ گویا اس گھر میں بسنے والے آسیب کا تعلق میری بیوی اور میرے بچّے سے تھا۔ میں سکتے کے عالم میں یہ الفاظ پڑھنے لگا۔ الفاظ کے رازوں سے میں اچھی طرح واقف

ہوگیا، مگر جیسے ہی میں نے اس بات کو محسوس کیا اچانک انگریزی کے یہ الفاظ مٹنے لگے۔ ہر شے سے، ہر چیز سے، جیسے ان کا مقصد پورا ہوگیا.... الفاظ اس طرح غائب ہو رہے تھے جیسے کوئی ڈسٹر سے انہیں مٹا رہا ہے۔ میں چاروں طرف گردن گھما کر الفاظ مٹتے ہوئے دیکھنے لگا۔ دیوار پر ایک اور جملہ لکھا ہوا نظر آیا۔ ایک بہت ہی عجیب جملہ ....:

Confess

مطلب قبول کرنا.... کسی بھی چیز کو ماننا۔ اپنے گناہوں کو ماننا۔ اس گھر میں بسا آسیب مجھ سے کچھ قبول کرانا چاہتا ہے.... اب میں سمجھا کہ ان الفاظ کا کیا مطلب تھا اور یہاں موجود طاقت مجھ سے کیا چاہتی ہے!.... میں سمجھ گیا تھا۔ میں جان گیا تھا۔

میں نے من ہی من میں ایک فیصلہ کیا۔ اپنے اندر مضبوطی پیدا کی۔ گہرا سانس لے کر میں چل پڑا۔ اب میرے قدم لاؤنج کی طرف بڑھ رہے تھے اور میں سکتے کے عالم میں سیڑھی اترتا چلا گیا۔ ایک بار پھر میں لاؤنج میں موجود تھا، اکمل کے کمرے کا دروازہ ابھی تک خاموشی سے مجھے تک رہا تھا۔ میں نے گھر کی ایک ایک شے پر نظر ڈالی اور پھر دروازے کو تکا۔ ایسا لگا جیسے سب چیزیں مجھ سے میرا اقبال جرم سننا چاہتی ہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے نفرت سے ہونٹوں کو سکیڑا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا:

’’تو تم مجھ سے کہلوانا چاہتے ہو؟ تم چاہتے ہو کہ میں اپنے منہ سے سب کچھ کہوں؟ ٹھیک ہے.... ایسا ہی سہی.... یہ سچ ہے.... میں نے قتل کیا ہے اپنی بیوی کا.... میں نے قتل کیا ہے اپنے بچّے کا....‘‘

☆......☆

میرے یہ جملے قیامت سے کم نہ تھے۔ میرے الفاظ اس گھر میں بسنے والی طاقت کی جیت تھی۔ مجھے لگا کہ میرے الفاظ سن کر جشن ہوگا مگر اس لمحے اس گھر کی ایک ایک شے خاموشی سے مجھے سن رہی تھی۔ گہرا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اپنی شیطانی نظر ہر چیز پر ڈالی۔ گہری مسکراہٹ لبوں پر لا کر کہنا شروع کیا:

’’یہ سچ ہے.... میں نے ہی اپنی بیوی کو ٹکڑوں ٹکروں میں کاٹ ڈالا تھا.... میں نے اپنے دو سال کے بچّے کے جسم کو کاٹا تھا.... وہ میں ہی تھا جس نے ان کو یہ دردناک موت دی.... نہیں دینا

چاہتا تھا.... میں اسے نہیں مارنا چاہتا تھا.... مگر.... مگر وہ جان گئی تھی.... کہ میں اس کے پیٹھ پیچھے کیا گل کھلا رہا تھا.... اس لیے اس کا مرنا بے حد ضروری تھا۔ مجھے جسم کی طلب تھی.... مجھے اور عورتوں کو پاس جانا تھا.... مگر ایک بیوی کے ہوتے ہوئے.... میں اپنی زندگی نہیں جی سکتا تھا.... ہوس کے اس سمندر میں ڈوبا ہوا.... میں دفتر چلا جایا کرتا۔ دفتر ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں مجھے دن بھر سکون نصیب ہوتا.... وجہ سارہ تھی.... میری سیکرٹری جو مجھ سے من ہی من میں محبت کرنے لگی تھی.... اور میں بھی اس کے جسم کا دیوانہ ہو گیا.... اس کا بدن.... اس کے جسم کی ایک ایک شے خدا کا ایک کرشمہ تھا.... اور میں آہستہ آہستہ.... سارہ کا غلام ہونے لگا۔ سارہ بھی مجھے پسند کرنے لگی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے عشق کرنے لگے۔ کئی مرتبہ ہم نے دفتر میں ہی جنسی محبت کی.... لیکن پھر ہم باہر ملنے لگے.... میں سارہ کو مہنگے سے مہنگے ہوٹل لے کر جانے لگا.... اسے تحفے دینے لگا.... اسے دنیا کی ہر خوشی دینے لگا....

اس رات میں نے اور سارہ نے تمام حدیں توڑ دیں۔۔ جب کہ دوسری طرف میری بیوی صبا میرے دو سال کے بچّے کو لوریاں سنا کر سلا رہی تھی۔ میں سمجھا کہ میں نے زندگی جیسے حاصل کر لی.... سب کچھ میرے پاس آ گیا.... مگر اس رات ہوٹل کی انتظامیہ نے چھپ کر ہم دونوں کی وڈیو فلم بنائی اور میری بیوی کو بھجوائی۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر وہ ٹوٹ گئی۔ ٹھیک دو دن بعد مجھے خبر آئی کہ سارہ میرے ہی باس کے ساتھ بھی رنگ رلیاں مناتی رہی ہے.... اور اس بات کا ثبوت مجھے تب ملا جب میں نے اپنے باس کے گھر پر چھاپا مارا.... اور دونوں کو برہنہ حالت میں پایا.... سارہ نے میرے حرامی باس سے لپٹ کر میرے سامنے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور مجھ سے صرف نفرت۔ وجہ نفرت صرف اتنی تھی کہ میرے پاس اب کچھ نہیں بچا تھا، نہ دولت نہ پیسہ اور شاید اب نوکری بھی نہیں۔ بے انتہا غیض و غضب میں بھرا ہوا میں گھر پہنچا تو یہ راز مجھ پر کھلا کہ صبا میری ننگی حقیقتوں سے واقف ہو گئی ہے۔ سب کچھ جان کر صبا نے اپنا منہ پیٹ لیا۔ اپنا ماتھا دیوار پر دے مارا۔ غم کے عالم میں اُس نے اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔ اس نے مجھے ذلیل کیا اور مجھ سے خلع لینے کی بات کی۔

میں دھک سے رہ گیا، بیوی، محبوبہ، نوکری، پیسہ اور دولت سے تو میں ہاتھ دھو ہی بیٹھا تھا۔ میرے پاس اب صرف یہ گھر تھا جو شاید طلاق کے بعد میرا نہ رہتا۔ کورٹ مجھ سے سب کچھ لے

سکتا تھا۔سب کچھ!۔طیش میں آ کر میں نے صبا کو بری طرح پیٹنا شروع کیا۔اسے مارا....اسے نوچا.... مجھ پر جیسے دیوانگی طاری ہوگئی ....شاید بے انتہا نفرت اور ناکامی نے مجھے یہ عمل کرنے پر مجبور کیا۔میں تہ خانے میں گیا اور وہاں سے کلھاڑی لے کر آیا....میں کمرے میں داخل ہوا تو صبا کو زخمی حالت میں باتھ روم میں پڑے ہوئے پایا۔شاید وہ کھسک کھسک کر باتھ روم تک چلی آئی تھی۔میں مسکرا کر اسے دیکھنے لگا،میرے ہاتھ میں کلھاڑی دیکھ کر صبا کی آنکھوں میں دہشت دوڑ گئی اور وہ مجھ سے زندگی کی بھیک مانگنے لگی.... مگر چھبیس اکتوبر کی اس رات کو مجھے خون کی پیاس تھی....اور میں کسی کا خون کرنا چاہتا تھا....اور اپنوں کا خون بہا کر بہت مزہ آتا ہے۔میں صبا کو بالوں سے پکڑ کر کمرے میں لے کر گیا اور اسے فرش پر پھینکا....اور پھر میں نے وہ کام کیا جو شاید بڑے سے بڑا درندہ تک نہ کر سکے.... میں نے اپنی بیوی کو کاٹ ڈالا....اس کے جسم کا ایک ایک حصہ....اس کے ہاتھ۔۔اس کے پیر....اس کا چہرہ.... غرض ایک ایک چیز کاٹ ڈالی۔‘‘

’’میری معصوم سی بیوی صبا اب دس حصوں میں میرے سامنے پڑی تھی....اس کی آنکھیں ابھی تک کھلی تھیں .... شاید وہ میرے اندر کا شیطان دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔صبا کو کاٹ کر میں پریشان ہوگیا،میری سمجھ نہیں آیا کہ اس کے ٹکڑوں کو میں دفن کردوں؟ کسی کچرے کے ڈبے میں پھینک دوں یا؟ یا جلا دوں؟ جلا دینے والی ترکیب مجھے بہترین لگی،کون سا حصہ کس طرح کاٹا گیا یہ بات پولیس کو کبھی بھی پتا نہیں چل سکتی تھی۔اس لیے میں واپس تہ خانے میں پلٹا اور مٹّی کے تیل کا ڈبہ لے کر اوپر آیا۔صبا کے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا اور اسے آگ لگا دی۔جلد ہی صبا میری آنکھوں کے سامنے جل کر ختم ہوچکی تھی۔میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پلٹ کر اکمل کے کمرے کی طرف چلا۔میرے ایک ہاتھ میں کلھاڑی تھی اور دوسرے ہاتھ میں تیل۔میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اپنے بیٹے کو زندہ چھوڑ دیا تو پولیس مجھے ہی حراست میں لیتی،یہ الزام لگا کر کہ بیوی سے جھگڑے کی صورت میں میں نے اس کا قتل کردیا،اس حادثے کو ایک عجیب رنگ دینے کے لیے مجھے میرے بیٹے کا قتل کرنا لازمی تھا۔اس لیے میرے معصوم اکمل کا مرنا بہت ضروری تھا.... تاکہ یہ عمل کسی پاگل.... کسی وحشی....درندے اور جنونی انسان کا عمل لگے۔بچّے کا کیا ہے؟ بچّے تو اور بھی پیدا ہوسکتے ہیں....یہ سوچ کر میں اکمل کے کمرے میں داخل ہوا تو میرا بچّہ Baby-Coad میں اطمینان سے سوتا ہوا نظر آیا۔میرا معصوم اور حسین ترین بچّہ۔اطمینان سے سونا اس کا حق تھا....

کیوں کہ صبا جیسی ماں کا وہ اکلوتا بیٹا تھا.... مگر اس بچّے کو اس بات کا علم نہ تھا.... کہ اسی کے سگے باپ نے اس کی ماں کو دس حصوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ میں نے بہت ہی پیار سے اپنے بیٹے کو اٹھایا، اس کا ماتھا چوما اور اسے زمین پر لٹایا۔ میرا دو سال کا معصوم سا بچّہ اطمینان سے سوتا رہا۔ میں نے اس کی گردن کا نشانہ لیا اور کلھاڑی سر سے بلند کر کے اس قدر زور سے ماری۔ کہ اکمل کا سر دور جا کر گرا۔ ننھے بدن سے خون کا فوّارہ پھوٹ پڑا اور جسم تڑپنے لگا۔ جلد ہی میں نے اکمل کے جسم کو بھی پانچ چھے حصوں میں تبدیل کیا اور پیٹرول چھڑک کر اس کے جسم کو آگ لگائی۔ اس سارے کام میں مجھے تیس سے چالیس منٹ لگے ہوں گے .... اور میں ہر ثبوت مٹا کر گھر سے نکلتا چلا گیا۔ میری منزل میری بہن حنا کا گھر تھا۔ صبح ماتم کرنے والوں میں سب سے آگے میں ہی تھا جو چلّا چلّا کر اپنی بربادی کا اعلان کر رہا تھا۔''

یہاں تک کہہ کر میں خاموش ہو گیا اور پورا گھر سکتے میں ڈوبا رہا۔ میں نے اپنے گھناؤنے جرم کا اعتراف کیا مگر اسے سننے والا کوئی نہیں تھا۔

''اب میں تین سال بعد اس گھر کو بیچنے کے لیے آیا ہوں.... تاکہ اس گھر کو بیچ کر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کینیڈا چلا جاؤں .... حنا اور فراز یہ سمجھتے ہیں کہ یہ گھر میں انہیں دے کر جاؤں گا...... ہاں! غلط سمجھتے ہیں وہ.... گھر کا لالچ نہ دیتا.... تو کیا وہ کتیا میری مدد کرتی؟ کیا وہ حرامزادہ فراز میری مدد کرتا!.... دونوں کو پاگل بنا کر میں اس گھر میں داخل ہوا۔''

یہ کہہ کر میں خوفناک ہنسی ہنسا اور کہنے لگا:

''مگر تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میرے گناہ کو سننے والا کوئی نہیں.... میں آج بھی آزاد ہوں.... اور میں تمھیں یہ بتاتا چلوں .... کہ ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد.... میں اس گھر سے زندہ سلامت نکلنے والا ہوں....

میں پلٹا اور ہنس کر کہنے لگا:

''صبا.... تم ہمیشہ اس گھر میں اپنا سر پٹختی رہو گی .... تمھیں کچھ نہیں ملے گا.... کچھ نہیں.... کچھ نہیں!''

یہ کہہ کر میں حیوانوں کی طرح ہنسنے لگا۔ میری ہنسی پوری گھر میں گونج رہی تھی۔ میں اکیلا دیوانوں کی طرح ہنس رہا تھا.... جھوم رہا تھا۔ میں کامیاب تھا.... اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود

میں کامیاب تھا۔

اچانک میری ہنسی کو جیسے دھکا سا لگا۔ میں ٹکٹکی باندھ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وجہ مسٹر جمیل تھا جو خوف کے عالم میں میرا چہرہ تک رہا تھا۔ اس نے میرے گناہ کے بارے میں ایک ایک لفظ سن لیا تھا۔ مسٹر جمیل کھڑا کانپ رہا تھا۔

میرے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ آ گئی۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جمیل خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس میں اب چلنے کی بھی سکت نہ رہی۔ میں اس کی طرف بڑھا۔

''اچھا؟ تو یہ وجہ تھی؟ مجھے اسپتال میں دیکھتے ہی تم اس وجہ سے مرے تھے.... کیوں کہ تم میرا راز جان گئے تھے؟''

یہ کہہ کر میں اس کی طرف بڑھنے لگا اور جمیل سکتے کے عالم میں پیچھے ہونے لگا۔

''ڈرو نہیں.... تمھارا حال وہ نہیں ہوگا جو اس گھر میں رہنے والوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے.... کیوں کہ ان سب کا قتل اس گھر میں بسنے والی چڑیل نے کیا ہے.... جب کہ تمھارا خون.... میں اپنے ہاتھوں سے کروں گا.... تمھیں مرنا ہوگا جمیل.... تمھیں مرنا ہوگا....'' میں نے اسے دیکھ کر کہا۔

''نن۔۔نہیں....'' جمیل رونے لگا۔

''یہ تمھارا مقدر ہے جمیل.... تم ویسے ہی مر چکے ہو.... میں تو بس ایک رسم ادا کر رہا ہوں....'' یہ کہہ کر میں سیڑھیاں چڑھنے لگا اور جمیل سکتے کے عالم میں پیچھے ہونے لگا۔

''تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں.... میں تمھیں صبا کی طرح کاٹوں گا نہیں!.... ویسے بھی گوشت کے لوتھڑے دیکھ کر.... مجھے الٹی آنے لگی تھی.... تمھارے گندے گوشت اور خوں کو دیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں.... میں تمھیں اتنی غلیظ موت نہیں دوں گا.... جتنی اس کتیا کو دی تھی.... میں وحشیوں کی طرح کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھتا رہا۔

''مجھے.... مجھے معاف کر دو.... میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا....''

جمیل روتے ہوئے التجا کرنے لگا۔

''میں جانتا ہوں.... میں جانتا ہوں تم کسی سے کچھ نہیں کہو گے.... کیوں کہ جب تم زندہ ہی نہیں ہو گے تو کسی سے کہو گے کیا؟'' میں نے خوفناک لہجے میں یہ جملے کہے۔

''نہیں!''

جمیل چلّایا اور پلٹ کر بھاگا، اس بار میں نے بھی پھرتی سے کام لیا اور چھلانگیں لگا کر اس تک جا پہنچا۔ میں نے جمیل کو دبوچ لیا تھا۔

جمیل بُری طرح رونے لگا۔ میں نے اس کا گریبان پکڑا اور اس کا چہرہ دیکھا۔ جمیل خوف سے کانپ رہا تھا۔ میرے چہرے سے خون بہہ رہا تھا اور میری آنکھیں اس قدر پھٹی ہوئی تھیں جیسے کوئی شیطان میرے اندر بس چکا ہو۔

"Farewell Mr.Jameel, See you in Hospital"

یہ کہہ کر میں نے اسے دھکّا دیا اور جمیل کھڑکی توڑتا ہوا سیدھا نیچے جا گرا۔

جمیل کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ سیدھا زمین پر گرا۔ دھم سے گرنے کی آواز مجھے اوپر تک آئی۔ جمیل کی ریڑھ کی ہڈّی ٹوٹ چکی تھی اور وہ مکمل طور پر بے ہوش تھا۔

میں شیطانوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ میرا گناہ ابھی تک سات پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں بری طرح قہقہے لگا رہا تھا اور میری خوفناک ہنسی پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ میں ہنستا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا، میرے قہقہے مزید بڑھتے چلے جا رہے تھے اور خوشی سے میرا من اچھل رہا تھا۔

میں ہنستا ہوا نیچے لاؤنج میں آیا اور قہقہے لگاتا رہا۔ میری پشت اب اکمل کے کمرے کی طرف تھی۔ میں دیوانوں کی طرح قہقہے لگا رہا تھا کہ اچانک گھر میں کسی بہت بڑی گھڑی کا گھنٹا سا بجنے لگا۔ میری ہنسی کو بریک لگا۔ آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔ گھنٹا بہت زور سے بج رہا تھا جیسے وہ کسی بات کا اعلان کر رہا ہو.... گھر میں اب بس گھنٹا بجنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ میں نے سکتے کے عالم میں نظر ڈیجیٹل کلاک پر ڈالی اور دیکھا وہاں لکھا تھا:

00:00:00

صفر کے ہندسے غائب ہوئے اور انگریزی میں لکھا ہوا نظر آیا:

Game Over

یہی وہ لمحہ تھا.... جب اکمل کے کمرے کا دروازہ کھلا۔۔

میرا خون خشک ہو گیا.... خون گردش کرنا بھول گیا.... جو دروازہ پچھلے چوبیس گھنٹے سے

نہیں کھل پایا تھا اب بڑی آسانی سے کھل گیا۔
کپکپاتی نظروں سے میں نے پلٹ کر دیکھا تو اکمل کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا اور اچانک دروازے کی پشت کے پاس سے جلا ہوا.... کٹا ہوا....اکمل باہر آیا....
خوف سے میں لڑکھڑا کر گرا۔ دہشت سے میرا بدن کانپ گیا۔آنکھیں اس قدر پھٹ گئیں کہ اب کبھی بند نہ ہوں۔
میرا دو سال کا بیٹا.... جس کو میں نے ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا تھا....اس کے ٹکڑوں کو جلا دیا تھا.... میرے سامنے موجود تھا....اس کا بدن جلا ہوا.... کٹا ہوا.... آنکھیں پوری طرح سرخ۔۔ اور اپنے ہاتھوں کو آگے کر کے وہ میری طرف بڑھ رہا تھا....
''پپ.... پا....''
اس نے کٹی ہوئی زبان سے مجھے پکارا اور میرا جسم جیسے جم گیا۔
اچانک مجھے سیڑھیوں کے پاس سے کچھ کھٹکے کی آواز آئی اور میں نے چونک کر سیڑھیوں کو دیکھا.... تو جیسے میرا دل بند ہونے لگا.... میں نے صاف دیکھا.... سیڑھیوں پر وہی سایہ موجود ہے.... مگر اب وہ ٹکڑوں میں تبدیل ہو رہا ہے.... صبا کے جسم کے ٹکروں میں....
کٹی ہوئی.... جلی ہوئی.... میری بیوی صبا.... نیچے اُتر رہی ہے اور وحشیوں کی طرح میری طرف بڑھ رہے تھے۔صبا کا قد پندرہ فٹ لمبا ہو چکا تھا!....اس کے ہاتھ چھ فٹ لمبے تھے!.... اس کا جسم جیسے پھیل سا گیا تھا....۔اس کی آنکھیں غائب تھیں!....اس کا چہرہ ضرورت سے زیادہ لمبا ہو گیا تھا۔یہی وہ بھیانک اور پر ہول منظر تھا جو اس گھر میں رہنے والوں کو نظر آتا تھا.... جسے دیکھ کر ان سب کے دل بند ہوئے تھے۔
میرے بچّے کے منہ سے جانوروں جیسی آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ میری طرف مستقل بڑھ رہا تھا.... صبا جلی ہوئی.... کٹی ہوئی.... میری طرف بڑھ رہی تھی.... میرے گناہ ہاتھ پھیلائے میری طرف بڑھ رہے تھے.... یہ منظر اس قدر بھیانک تھا کہ میرا دل بند ہونے لگا....
گھنٹے کی آواز مسلسل گونج رہی تھی!.... صبا اور میرے بچّے کے منہ سے جانوروں جیسی آوازیں نکل رہی تھیں...... میری کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا.... میری سانسیں جیسے اکھڑنے لگیں.... میں مر رہا تھا.... آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا.... میں

آہستہ آہستہ مر رہا تھا.... میں دیوار سے ٹکرایا.... اور زمین پر گرا.... میرا دل بند ہو چکا تھا.... مجھے ہارٹ اٹیک ہوا تھا.... میں مر چکا تھا۔

☆......☆

Street 12

Ali

صبح دس بجے کے قریب فراز کی گاڑی House No. 24/10 Street 12 پر آ کر رکی۔ فراز اور حنا دونوں گاڑی میں سے اترے اور گھر کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھے۔ فراز نے گھنٹی بجائی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ فراز نے دوبارہ گھنٹی بجائی مگر دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔

''لگتا ہے روحیل ابھی تک سو رہا ہے۔'' فراز بڑبڑایا۔

''روحیل اتنی دیر تک سونے کا عادی نہیں ہے۔'' حنا نے پریشان ہو کر کہا۔

''شاید زیادہ تھکن کی وجہ سے وہ ابھی تک سو رہا ہو۔'' فراز نے اسے دیکھ کر کہا۔

''نہیں فراز، آپ دوبارہ بیل بجائیں۔'' حنا نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

''اوکے....''

فراز نے مختصر جواب دیا اور دوبارہ بیل بجائی مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ حنا نے بے خیالی میں مرکزی دروازے کا ہینڈل پکڑ کر کھولنا چاہا تو دروازہ کھل گیا۔ دونوں چونک پڑے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ حنا نے فراز کو اور فراز نے حنا کو دیکھا اور پھر دونوں اندر کی طرف چل پڑے۔ لاؤنج میں سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا، ایک طرف ٹیلیویژن ٹوٹا پڑا تھا تو دوسری طرف اکمل کے دروازے پر کلھاڑیوں کے نشان موجود تھے، پورے گھر میں اس وقت بلا کی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا لگا جیسے گھر میں کوئی شخص موجود نہ ہو۔ فراز نے

دروازہ بند کیا اور حیران ہو کر لاؤنج کو دیکھنے لگا۔

''یہ سب کیا ہوا ہے؟'' حنا نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' فراز گھبرا کر بولا۔

''فراز....''

حنا کے منہ سے نکلا اور اس نے اشارہ کیا.... فراز نے اس کا اشارہ دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ اکمل کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ فراز اور حنا نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اکمل کے کمرے کی طرف بڑھے۔ دونوں کے قدم اکمل کے کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ اس کے کمرے سے قریب ہو رہے تھے۔ فراز نے دروازہ کھولا اور اندر جھانکا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''یا خدا! یا خدا....''

حنا اپنے بالوں کو پکڑ چیخ اٹھی اور پلٹ کر گھٹنوں کے بل گری۔

''حنا۔ حنا!۔ سنبھالو اپنے آپ کو!'' فراز نے پلٹ کر حنا کو سنبھالا۔

''کاٹ دیا۔ کاٹ دیا میرے بھائی کو بھی دس حصوں میں۔ جلا دیا اس کے ٹکڑوں کو۔ اس آسیب نے میرے بھائی کو بھی دس حصوں میں کاٹ ڈالا!''

حنا کانپتی ہوئی بولنے لگی۔

''حنا، حنا پلیز سنبھالو اپنے آپ کو.... پلیز سنبھالو.... میں پولیس کو لے کر آتا ہوں۔''

فراز نے روتے ہوئے اسے سنبھالا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ حنا فرش پر بیٹھی ہوئی روتی رہی۔ فراز روتے ہوئے مرکزی دروازے کی طرف بڑھا اور ہینڈل پکڑ کر کھولنا چاہا مگر یہ کیا۔ دروازہ تو بند ہو چکا تھا۔ فراز دھک سے رہ گیا اور دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر وہ نہیں کھلا۔ خوف کی ایک لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ حنا کو بھی جب حقیقت کا اندازہ ہوا تو وہ بھی خوفزدہ ہو گئی اور فراز کی طرف دیکھنے لگی۔ آنسو اس کے چہرے سے غائب ہو چکے تھے۔ اب وہ دونوں اس گھر کے قیدی تھے۔ اچانک جیسے کوئی گھڑی بجنے لگی.... جیسے کوئی چھوٹا سا الارم بج رہا ہو.... حنا اور فراز نے چونک کر ایک دوسرے کو

دیکھا۔ ان کی نظریں دیوار پر جا ٹکیں!..... ڈیجیٹل کلاک پر الٹی گنتی شروع ہو چکی تھی:

23:58:32

اختتام؟

ali's

STREET 12

hauntings of past

Street 12 is a prequel to the dream which I had a long time ago. A dream which scared me to death and whenever I think about it scares me more. Street 12 is a story behind the dream which I tried my level best to bring into life. A lonely man trapped inside a house of Street 12. He must survive next twenty-four hours or else...

Aeina Publications